دوسری عورت
(افسانوں کا مجموعہ)
نثار راہی

دوسری عورت

(افسانوں کا مجموعہ)

دوسری عورت

(افسانوں کا مجموعہ)

نثار راہی

پروفیسر اسلم آزاد، رکن بہار قانون ساز کونسل کے
ترقیاتی فنڈ سے طلبہ کی فلاح کے لیے فراہم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

DUSRI AURAT
(Afsano Ka Majmua)
by
Nisar Rahi
Year of Ist Edition 2010
ISBN 978-81-8223-650-9
Price Rs. 300/- (Library Edition)

نام کتاب : دوسری عورت (افسانوں کا مجموعہ)
مصنف : نثار راہی
سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۱۰ء
قیمت : ۳۰۰ روپے (لائبریری ایڈیشن)
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنی تین چھوٹی بہنوں

کنیز فاطمہ (بھوپال)

عزیز فاطمہ عرف شمیم (بھوپال)

اور

طلعت فاطمہ (کراچی)

کے نام

جو میرے لئے دل میں بہت محبت رکھتی ہیں

اور

میری سلامتی کی دعائیں مانگتی ہیں۔

☆☆

فہرست

☆☆

فنکار

نرسنگ ہوم کی آرام دہ وین آگئی تھی جو بطور ایمبولینس استعمال کی جاتی تھی۔
رومانی صاحب کو ان کے داماد محمد احمد نے اپنے کندھے پر ڈالا اور زینے اتر کر نیچے وین میں لٹادیا۔ پیچھے سے بیوی قیصر جہاں، بیٹی راحت اور بیٹا اسلم دوڑ کر آئے اور وین میں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ پھر جلد ہی سجاد نرسنگ ہوم کے سخت نگرانی روم تک خیریت سے پہنچ گئے۔ وہاں پہنچے تو ڈاکٹر کپور اور ان کے پیچھے ان کے دو معاون ڈاکٹر دوڑے دوڑے آئے۔ بی پی چیک ہوا، E.C.G کیا اور ایکو مشین سے دل کی جانچ کی گئی۔ دل کا دورہ سخت تھا۔ دیگر دواؤں کے علاوہ خون میں پھنسے کلاٹنگ کی صفائی کے لئے ایک مخصوص انجکشن Uro-kunase دیا گیا اور پھر تاروں کے ذریعہ دل کے نظام کو مانیٹر سے جوڑ دیا گیا۔ اسکرین پر ڈاکٹر دیکھ رہے تھے کہ دل ڈوب رہا تھا۔ لیکن دیکھنا یہ تھا کہ دوائیاں دل پر اب کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور دل کی بہتری کے لئے کچھ کر پاتی بھی ہیں کہ نہیں۔
گھر کے سبھی لوگ روم سے باہر تھے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔
شام سے رات اور رات سے پھر صبح ہوئی۔ شاید سورج کا کام روشنی اور حرارت کے علاوہ آسمانی پیغام لانا بھی ہوتا ہے۔ زندگی کا یا پھر موت کا پیغام۔ وہ پھولوں کو اور دلوں کو رعنائی بخشتا ہے اور اگر اسے غصہ آجائے تو کبھی کبھی ان کو جلا بھی دیتا ہے۔ دراصل کچھ نازک سے انسانوں کے دل بھی پھول جیسے ہوتے ہیں جو کسی روز کھلنے کے بجائے مرجھا جاتے ہیں۔ آج کا سورج آیا تو رومانی صاحب کا مرجھایا ہوا دل کھل گیا۔ وہ خطرے سے باہر آگئے۔ دھیرے دھیرے ہوش بھی آنے لگا اور گھر والوں کو پہچاننے بھی لگے۔

دوسری بار وہ موت کے منہ سے لوٹے تھے۔ پہلا اٹیک دو برس قبل ہوا تھا۔ اس وقت بھی ان کی زندگی کا بچ جانا ایک کرشمہ تھا اور آج بھی۔ اور جب انسان کرشموں سے جی جائے تو اس کی قدر ہونے لگتی ہے۔

تیسرے روز اخبار والے اور فوٹو گرافر آ گئے۔ رومانی صاحب کو اچھا لگا۔ ڈاکٹر سے ہاتھ ہلا کر اور مسکرا کر اشارہ کیا کہ ان کو آ جانے دیں۔ ڈاکٹر کو مریض کی خوشی بھی دیکھنا تھی۔ وہ خطرے سے باہر تو آ ہی چکے تھے۔

چوتھے روز اخباروں میں آ گیا کہ مشہور کہانی کار عبداللہ رومانی دل کے دورے کو جھیل گئے اور موت کے منہ سے نکل آئے۔

سات دنوں بعد ڈاکٹر نے چھٹی دے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ اس بار وہ مکمل پرہیز کریں۔ کھانے کا بھی اور کام کا بھی۔ لکھنے سے جو دماغی تناؤ ہوتا ہے اس سے بھی دل متاثر ہوتا ہے، لہٰذا اب ان کو لکھنا پڑھنا چھوڑنا ہوگا۔ چھوڑنا ہی ہوگا نہیں تو پھر وہ ذمے دار نہ ہوگا۔ تیسرے اٹیک کو دعوت نہ دی جائے، ورنہ وہ ہر حال میں مہلک ثابت ہوگا۔

رومانی صاحب گھر آ گئے۔ جان بچی تو اس بار ہر چیز بہت اچھی لگی۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دوسرا جنم ہوا ہو۔ جیسے گھر میں عید یا دیوالی آ گئی ہو۔ خوشی یہ تھی کہ مٹی بنتے بنتے رہ گئے۔ انسان بنے رہنا اور اپنی دنیا میں واپس آ جانا انہیں اچھا لگا۔ نیلا نیلا آسمان، ہرے بھرے درخت، اڑتے ہوئے سفید سفید پرندے، جھیل کا چمکتا ہوا پانی، رنگین لباسوں میں خوبصورت کھلکھلاتی عورتیں، دیدہ زیب رسائل اور ان میں چھپی ان کی کہانیاں۔ یہ سب ان کے لئے اس دنیا کی بہت پرکشش چیزیں تھیں۔

رومانی صاحب نے تین ماہ خوب آرام کیا۔ سوتے رہتے، ٹیلی ویژن دیکھتے یا پھر موسیقی سننے لگتے۔ موزارٹ، روی شنکر یا پھر پروین سلطانہ۔ ممنوعہ تھا تو اچھا کھانا، لکھنا اور پڑھنا۔ پھر جب دل گھبرایا تو کار سے آؤٹ ڈور لے جائے جانے لگے۔ پہلے شہر کے کسی گارڈن میں، پھر شہر سے دور...... کسی جنگل میں یا پھر کسی جھیل کے کنارے۔ ان کے ساتھ گھر کے کئی لوگ ہوتے۔ بیوی، بیٹا بیٹی اور کبھی کبھی داماد بھی۔ وہ لطیفے سناتے اور سب لوگ پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرتے کرتے قہقہے لگاتے۔ زندگی اب بھی کچھ بری نہیں تھی۔ پہلے گھر

میں برسوں بیٹھے رہے تھے۔ بس قلم تھا اور تصور کی اڑان تھی۔ جنگل سے، پرندوں سے اور فرحت بخش قدرتی ہواؤں سے پچھلے دنوں کوئی ناتہ ہی نہ رہا تھا، جب کہ یہ سب کے سب دل ودماغ کی تازگی کے لئے کس قدر ضروری تھے۔

پھر سیمینار یا کسی کسی ادبی جلسے میں شرکت کرنے لگے۔ لیکن صرف تماشائی بن کر۔ اسٹیج پر جانا اور کچھ بولنا بھی ممنوع تھا۔ ہلکے پھلکے انٹرویو دے دیتے۔ کہتے کہ بہت لکھ لیا، اب میں ریٹائر ہوگیا ہوں، آرام کروں گا۔ کئی کہانیاں لکھنے کے لئے قارئین کے خطوط بھی آرہے تھے اور مدیران کے بھی۔ رسائل وہ دیکھ تو سکتے تھے لیکن پڑھنا ممنوع تھا اور قلم ہاتھ میں لینا تو ممنوع ہی نہیں، ان کے لئے کوئی جرم سرزد کردینے جیسا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ سوتے سوتے، موسیقی سنتے سنتے اور جنگل کی تفریح کرتے کرتے اوب گئے۔ ہر چیز کی کشش جانے لگی اور زندگی بے مقصدسی لگنے لگی۔ بے مقصد زندگی سے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی۔ یہ خیال ہوتا کہ اب وہ کسی کام کے نہیں رہے۔ ان کا کام تو سوچنا تھا اور لکھنا جو ڈاکٹر نے اور گھر والوں نے چھڑوا دیا تھا۔ اگر...... اگر تھوڑا سوچ لیں اور تھوڑا لکھ لیں تو کیا نقصان ہو جائے گا۔ اور کچھ کچھ رسائل کا مطالعہ کرنے لگیں تو بے شک انہیں بے پناہ خوشی کا احساس ہوگا۔ دل کو کسی طرح خوش رکھیں گے تبھی تو دل سلامت رہے گا۔ دل کی اداسی ہی دل کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

کبھی وہ اسٹڈی روم چلے جاتے اور اپنی نامکمل کہانیوں کو دیر تک دیکھنے لگتے یا رسائل کو بھی کچھ زیادہ دیر دیکھتے تو بیوی آجاتی اور ان کو باہر لے جاتی۔

اور تب وہ بیٹھے بیٹھے لکھنے پڑھنے سے ہونے والے نقصان اور فائدے کا تجزیہ کرنے لگتے۔ لکھنا پڑھنا ہی انہیں ہر حال میں سودمند نظر آتا۔ لیکن یہ سب پھر سے شروع کرنا اب آسان نہ تھا۔ ان پر پہرے بیٹھے تھے۔ لکھائی پڑھائی کے دشمن تھے سارے کے سارے۔ اگر قلم اٹھا لیتے تو ڈانٹ پڑ جاتی۔ گھر میں ہر ایک ناراض ہو جاتا۔

تو پھر......؟

ہارٹ اٹیک کو ابھی صرف ایک برس ہی ہوا تھا۔

سب لوگ کولارڈیم کے پارک کی باریک باریک گھاس پر بیٹھے کھا پی رہے تھے۔

رومانی صاحب پاس ہی کی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیوی بھی پاس ہی تھی جو سامنے گلابی اور سرخ رنگت کے گلابوں کی خوبصورتی میں کھوئی ہوئی تھی۔ تبھی رومانی بڑبڑائے۔

''لڑکی ناراض ہوگئی ہے اور اپنا گگرا اٹھا کر پنگھٹ پر جانے لگی ہے...... پیچھے پیچھے وہ لڑکا آرہا ہے...... اس کو منانے......''

''کہاں ہے لڑکی...... اور کہاں ہے وہ لڑکا...... مجھے تو نظر نہیں آتے'' بیوی نے پوچھا۔

''آں...... وہ تمہیں نظر نہیں آتے مگر مجھے نظر آرہے ہیں......''

''خیالوں میں............ ہے نا......؟ یعنی آپ پھر شروع ہوگئے۔ دیکھئے باز آجایئے اور اپنے تصور کی کھڑکی کو بند ہی رکھئے...... اگر زندگی چاہئے......''

''کیا ہوجائے گا مجھے؟ کیا مرجاؤں گا میں؟'' وہ درشت لہجے میں بولے'' تم بھی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ تھوڑا سا لکھنے سے اور تھوڑا سا پڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ میرا دل ہی تو بہلے گا۔''

''اب میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ تمہارے پاس تھوڑا سا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر چیز خوب ہی خوب ہوتی ہے۔ لکھنا پڑھنا برا نہیں ہے، ہر وقت سوچتے رہنا برا ہے۔''

وہ لاجواب ہوگئے اور سب لوگ گھر آگئے۔

کہانی پھنس کر رہ گئی ان کے دماغ میں اور جب کہانی دماغ میں پھنس جائے تو نکلے کیسے۔ وہ آتی ہے قلم کے ذریعے کاغذ پر اور قلم وہاں دور دور تک نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو اسے ہاتھ میں لینے پر سخت پابندی تھی۔ ان کی حالت اس مرغی جیسی تھی کہ جو انڈا دینے کے لئے بے چین رہتی ہے اور کوئی مناسب جگہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

وہ پریشان تھے اور پریشانی میں ہر کچھ سوچنے لگے تھے۔

کوئی نہیں سمجھتا کہ تخلیقی عمل سے پہلے کا وقت کتنے Tension یعنی ذہنی تناؤ کا ہوتا ہے۔ جب تخلیق وجود میں آجاتی ہے تبھی سکون ملتا ہے۔ اب یہ بات ڈاکٹر اور گھر والے کیا جانیں کہ ان کا ذہن عام ذہن نہیں ہے بلکہ اس میں کہانی کے کیڑے کلبلانے لگتے تھے۔ جب تک انہیں دماغ سے خارج نہ کر دو وہ پریشان کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ لکھیں گے نہیں

تو ذہن پریشان ہوگا۔ذہن پریشان ہوگا تو دل بھی متاثر ہوگا اور دل متاثر ہوگا تو......

ان کو اپنا علاج خود ہی کرنا ہوگا۔چوری چوری۔وہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے مگر موقع ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔وہ کچھ صحت مند کیا ہوئے کہ کچھ اور آئیڈیاز ان کے دماغ میں آ گئے۔آئیڈیاز جن سے کہانیاں بنتی ہیں۔

اب رسائل میں ان کی کہانیاں آنا بند ہو گئی تھیں۔جب پہلے کہانیاں شائع ہوتی تھیں تو سنسنی لے کر آتی تھیں۔سنسنی ہی کیوں،ایک تہلکہ مچ جاتا تھا۔ہر کوئی آتا تھا اور تعریف کرتا تھا۔ادبی حلقوں میں بھی کہانی کا ذکر ہوتا تھا۔پھر قائین کے خطوط بھی آتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے...... بہت پر لطف دن تھے وہ۔ہر طرف عبداللہ رومانی کے نام کا چرچہ تھا۔اردو کے علاہندی رسائل میں بھی اور انگریزی رسائل میں بھی جمود طاری ہو گیا تھا اور زندگی کا جیسے لطف ہی چلا گیا۔ایک عام سے آدمی ہو کر رہ گئے تھے وہ۔

کچھ کرنا ہوگا۔کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔بیوی سے چوری چوری۔سب کی آنکھیں بچا کر۔وہ دن میں سوتے تھے اس لئے رات میں دیر سے نیند آتی۔ان کے سونے سے پہلے سبھی بستروں میں جا دبکتے اور جلد ہی خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے۔

انہوں نے اپنے پوتے کا پین چرا لیا۔اور ایک کاپی بھی۔اب اچھے سفید کاغذ دستیاب نہیں تو کاپی ہی سہی۔ٹینشن تو دور کرنا ہے۔ایک نئی تخلیق وجود میں لانا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے جو ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔تخلیق کاروں کا اسی مقصد سے جنم ہوا ہے تو وہ اپنے مقصد سے دور کیوں رہیں۔پھر رسائل میں بہت دنوں سے نام بھی نہیں آیا۔اور نئی کہانی سے ہونے والا کوئی تہلکہ بھی نہیں مچا۔لوگ بہت جلد بھولنے سے لگے ہیں انہیں۔ لیکن عبداللہ رومانی ابھی مرا نہیں ہے۔ابھی اس کے جسم میں سانس آتی جاتی ہے۔دماغ بھی ماؤف نہیں ہوا ہے۔ابھی ان کی عمر میں کیا ہے۔صرف ۶۲ سال۔۶۲ سال میں کوئی بوڑھا ہوتا ہے کیا۔۶۲ سال تو پختگی کی عمر ہوتی ہے۔اسی عمر میں تو کچھ اچھا لکھا جا سکتا ہے۔ شاید اب کوئی معرکہ آراء کہانی وجود میں آ جائے۔

سب لوگ سو گئے تو انہوں نے قلم ہاتھ میں اٹھا لیا۔بہت اچھا لگا۔جیسے زندگی پھر سے بامقصد بن گئی۔

...... لڑکی ناراض ہو کر پنگھٹ پر چلی۔ وہ پیچھے پیچھے اس کو منانے آیا...... تنہائی تھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نہیں تھا...... درخت کی آڑ میں اس نے لڑکی کو بانہوں میں......

چار صفحات لکھ لئے اور قلم بند کر دیا۔ کچھ تھکن ہو گئی تھی۔ چوری چوری اتنا لکھ لینا ہی کافی تھا۔ تسلی تو ہوئی۔ دماغ کا تناؤ تو دور ہوا۔

دوسری رات پھر قلم اٹھایا۔

تیسری رات اور چوتھی رات بھی۔

پانچویں رات بیوی نے پکڑ لیا۔ شور مچانے لگی۔

''ارے دیکھو، غضب ہو گیا...... کافیہ...... اسلم...... جلدی سے ادھر آؤ...... دیکھو یہ کیا کر رہے ہیں۔...... کہانی لکھ رہے ہیں...... نہ جانے کتنی راتوں سے لکھ رہے ہیں۔ اب تو ان کی خیر نہیں۔ تیسرا اٹیک جان لیوا ہوتا ہے۔''

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے'' آنکھیں ملتے ہوئے آکر داماد نے کہا ''ڈاکٹر نے صاف منع کیا تھا آپ کو لکھنے سے پھر بھی......''

''تم لوگ نہیں سمجھو گے'' انہوں نے اپنی دلیل پیش کی ''تم نہیں سمجھو گے کہ کوئی بھی فنکار اپنے تخلیقی عمل کو ٹھوکر مار کر خوش نہیں رہ سکتا۔ اور تم نہیں سمجھو گے کہ تخلیق کرنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ میں کہانیوں کو نہیں پکڑتا۔ کہانیاں خود مجھے بلاتی ہی......''

''آخر کتنی کہانیاں لکھیں گے آپ'' بیوی نے کہا ''آپ کی سات کتابیں چھپ چکی ہیں، بے شمار انعامات مل چکے ہیں اور آپ کے نام کی دھوم مچ چکی ہے۔ اس کے بعد تو پھر سوائے ہوس کے کچھ نہیں......''

رومانی صاحب نے ان سب کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی ملزم اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے رحم طلب نگاہوں سے جج کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ بولے ''میری دنیا میری خود کو بنائی ہوئی ایک دنیا ہے۔ اور وہ ہے کہانی کی دنیا۔ کہانی کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ کہانی میری دوا ہے، میرا ٹانِک ہے۔ کہانی کی اشاعتوں سے ادب کی دنیا میں جو ایک تہلکہ ہوتا ہے مجھے اس کی عادت سی پڑ گئی ہے اور تم چاہو تو مجھے انسان سمجھو ہی نہیں۔ میں صرف ایک کیڑا ہوں۔ قلم کا کیڑا۔ جیسے کہ ریشم کے یا شہتوت کے کیڑے ہوتے ہیں، یا پھر انسانوں

میں ہی روپیہ بنانے کے کیڑے ہوتے ہیں۔ میرے زندہ رہنے سے تم سب کو تو کچھ فائدہ ہوسکتا ہے لیکن میرے اس طرح اجاڑ زندہ رہنے سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مجھے زندہ رکھنا ہے تو مجھے خوشی بھی دینا ہوگی اور تم سب یہ خوب جانتے ہو کہ مجھے خوشی کس بات سے ملے گی۔ کہانیوں کو جنم دینے سے۔ یعنی اپنے تخلیقی عمل کو حرکت میں رکھنے سے......''

وہ سب لاجواب ہوگئے۔ دیگر لوگ تو بس ان کا منہ دیکھنے لگے لیکن بیوی اپنے تصور میں ایک کہانی بننے لگی۔

کہ سینے کے درد سے رومانی صاحب کراہنے لگے۔

کہ نرسنگ ہوم کی وین آئی اور چند منٹوں میں ہی انہیں ایک بار پھر نرسنگ ہوم پہنچادیا گیا۔ ڈاکٹر دوڑے دوڑے آئے۔ دل ہی دل میں مریض کے لئے دعائیں مانگی گئیں...... لیکن...... اس بار رومانی صاحب بچائے نہ جاسکے!

استحصال

میں نے ایک رات ایک خواب دیکھا۔ بڑا عجیب سا خواب تھا وہ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تین چار لڑکوں نے......نہیں......شاید پانچ سات لڑکوں نے مجھے اور میرے بیوی بچوں کو کسی پہاڑی علاقے کی طرف جانے والی ایک ریل میں بٹھا دیا ہے۔ ریل چل پڑی ہے۔ ریل میں سواریاں بہت کم ہیں۔ ہم لوگ کھڑکی کے قریب ہی بیٹھے ہیں اور جب ریل آگے بڑھتی جاتی ہے تو پہاڑوں کے بڑے سہانے مناظر ہمارے سامنے آتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ریل پہاڑی علاقے میں آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ پانچ سات لڑکے بھی ساتھ ہی چل رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگ گاڑی میں بیٹھتے نہیں ہیں۔ یا تو وہ دروازے پر کھڑے رہتے ہیں یا پھر گاڑی میں ہنستے ہوئے، کلکاریاں مارتے ہوئے ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی اسٹیشن آتا ہے تو دوڑ کر اتر جاتے ہیں۔ ان میں سے دو تین لڑکے ہمارے لئے کھانے کو کچھ لاتے ہیں۔ کوئی اسٹیشن آتا ہے۔ باقی لڑکے نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ذرا دیر بعد ہی پھر ریل میں بھاگتے ہوئے ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ وہ لوگ ہنس رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ یعنی پوری ریل گاڑی میں خوشی کا ماحول ہے۔

پھر ریل کئی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں سے گذرتی ہے۔ میں اور میرے بیوی بچے اس خوش گوار سفر سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ منزل پر پہنچنے کے بعد گاڑی پھر واپسی کو چل پڑتی ہے۔ ہم سبھی لوگ اس گاڑی میں اب بھی بیٹھے ہیں اور تب مجھے پتہ چلتا ہے کہ لڑکوں نے ہمارے ٹکٹ نہیں لئے تھے اور ہمیں مفت میں یعنی بغیر

ٹکٹ سفر کرا رہے تھے اور اس طرح ہمیں خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم لوگ خوشی خوشی سفر کر رہے تھے کہ ایک اسٹیشن پر اتر کر پلیٹ فارم پر میں ٹہلنے لگا۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی سادے کپڑوں میں میرے سامنے آیا اور کہنے لگا ''میں چیکر ہوں! آپ نے ابھی تک پانچ ہزار روپے کا سفر کرلیا ہے، فوراً ادا کیجئے، نہیں تو میں آپ کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔''

یہ سن کر میں گھبرا گیا۔ ادھر سے ادھر بھاگنے والے اور خوش ہونے والے لڑکے غائب ہو چکے تھے۔ میرا اور ان کا کیا رشتہ تھا، یہ بھی میں نہ جان سکا تھا۔ میں دوڑ کر بیوی کے پاس گیا اور اس سے کہا ''ہم لوگ پھنس گئے ہیں، جس سفر کو ہم مفت کا سمجھ رہے تھے، وہ مفت کا نہیں ہے۔ اس کا تو اب جرمانہ بھی دینا ہوگا۔''

بیوی گھبرا گئی۔ نہ اس کے پاس روپے تھے نہ میرے پاس، کیونکہ ہم لوگ مفت کا سفر کرنے جو نکلے تھے۔ لیکن ہمیں ایک ترکیب سوجھی۔ ہم نے چیکر کو جھانسہ دینے کے لئے ڈبہ بدل دیا اور سوچا کہ اب ہم پکڑ میں نہیں آئیں گے۔ لیکن کچھ دیر بعد ایک دوسرا شخص ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے کہا ''چیکر صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ اب آپ پر سات ہزار کی رقم چڑھ گئی ہے۔ آپ فوراً مجھے یہ رقم دیجئے، نہیں تو آپکو پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔''

یہ سن کر ہم لوگ اور بھی گھبرا گئے اور تب سمجھ میں آیا کہ بچنے کا اب کوئی راستہ نہیں، ہم پر پوری طرح نگرانی کی جارہی ہے۔ بیوی نے اپنے کچھ زیورات اتار کر مجھے دیئے اور کہا ''جائیے انہیں فروخت کردیجئے اور ان کو فروخت کرکے جو رقم حاصل ہو اس سے کرایہ کی اور جرمانے کی رقم ادا کردیجئے۔''

لیکن وہ زیورات میں نے کسی جیب میں رکھ کر چھپا لئے اور کرایہ بچانے کی نیت سے اگلے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چھپ چھپا کر بھاگنے لگا۔ اچانک وہی چیکر میرے سامنے آ گیا اور پولیس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ پولیس سیٹیاں بجانے لگی۔ میں بھاگنے لگا...... پولیس مجھے پکڑنے میرے پیچھے بھاگی۔ میں آگے...... پولیس پیچھے...... سیٹیوں کی آوازیں...... شی شی شی...... شی شی شی...... اور تبھی میری نیند کھل گئی۔ نیند کھلی تو دھیان آیا کہ ریل کا کرایہ اور جرمانہ مانگنے والا جو چیکر میرے سامنے آیا تھا وہ آنند شرما تھا۔

آنند شرما۔ میرا ایک موکل۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اس کا کیس لڑا تھا۔ مقدمے کے آخر میں وہ بری ہو گیا تھا۔ لیکن پھر وہ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر جا چکا تھا۔ کچھ روز بعد میں نے پھر خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک طالب علم ہوں اور سبق یاد نہ کرنے کے باعث ٹیچر نے مجھے کلاس روم میں کھڑا کر دیا ہے۔ پھر وہ ٹیچر آگے بڑھا اور اپنی چھڑی میری کھلی ہتھیلیوں میں مارنے لگا۔ وہ زور زور سے مار رہا تھا اور میں چیخنے چلانے لگا تھا۔ ارے مار ڈالا...... ارے مار ڈالا...... اب نہیں کروں گا...... اب نہیں کروں گا۔

اور پھر میری نیند کھل گئی۔ نیند کھلی تو دھیان آیا کہ چھڑی سے مارنے والا ٹیچر کوئی اور نہیں، آنند شرما ہی تھا۔

آپ شاید یقین نہ کریں، لیکن یہ سچ ہے کہ تیسری بار پھر جلد ہی میں نے خواب دیکھا اور خواب میں پھر آنند شرما سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجسٹریٹ تھا اور میں ملزم۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی اور چہرہ رعب دار تھا۔ ڈائس پر بیٹھا ہوا، وہ مجھے اتنی سخت نظروں سے دیکھتا تھا کہ میں ڈر جاتا تھا۔ کیس کے ٹرائل کے دوران ہی میں یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے آخر میں سزا ضرور دے گا۔ یہ سمجھ کر میں ڈرا جا رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے گرجدار آواز میں کہہ دیا "مسٹر منوج آپ پر غبن کا جرم ثابت ہے۔ آپ کو دو سال کے لئے قید بامشقت......"۔

سزا کا سننا تھا کہ دو سپاہیوں نے کس کر مجھے پکڑ لیا۔ میں چیخ اٹھا اور چیخا تو نیند کھل گئی۔ میری چیخ سے بیوی کی نیند بھی کھل گئی۔ میرا چہرہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ سزا کے حکم کا اثر ملزم پر کتنا بھیانک ہوتا ہے، یہ میں نے پہلی بار سمجھا۔

میں نے بیوی سے کہہ دیا کہ خواب میں آ کر آنند شرما مجھے پریشان کر رہا ہے اور مجھے ذہنی اذیت دے رہا ہے۔ بیوی نے پوچھا کہ یہ آنند شرما کون ہے، تو میں نے آنند شرما کے بارے میں بیوی کو سب کچھ بتایا۔

آنند شرما پر غبن کا کیس چلا تھا۔

چلئے...... شروع ہی سے اس کا قصہ سناتا ہوں۔

میری شادی سے پہلے ہی میری فوجداری وکالت جم چکی تھی اور اُن دنوں فوجداری وکیل کی حیثیت سے میں دن بہ دن معروف ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی آس پاس کے چھوٹے

شہر والے ملزمان بھی مجھے اپنے شہر کی عدالتوں میں دن بھر کے لئے ٹیکسی میں لے جاتے تھے۔ ان دنوں میں اپنے ایک دن کی فیس ڈیڑھ ہزار سے دو ہزار روپے تک لے لیتا تھا جو ان دنوں میں بڑی رقم ہوتی تھی۔ پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر جاتا جس سے موکل کے دو تین سو روپے علیحدہ خرچ ہو جاتے۔ موکل سے خرچ زیادہ کرا کے میں خوش ہوتا تھا کیونکہ اس سے مجھے اپنی اہمیت اور برتری کا احساس ہوتا تھا۔

ایک دن یہ آنند شرما میرے پاس آیا اور مجھ سے بولا کہ وہ کاشتکاروں کے لئے بنائی گئی کوآپریٹو سوسائٹی میں سیکریٹری تھا کہ اسی دوران اس پر غبن کا الزام لگ گیا اور اب سیہور کے سیشن کورٹ میں اس پر فوجداری مقدمہ چل رہا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس نے میرا بڑا نام سنا ہے اور وہ مقدمے کے لئے مجھے وکیل کرنا چاہتا ہے اور یہ کہ پیشیوں پر سیہور جانے کے لئے مجھے وقت نکالنا ہی پڑے گا۔ سیہور میرے شہر سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور ہے۔

اس وقت میرے دماغ نے تیزی سے کام کیا۔ میں نے سوچا کہ کمائی کا موقع اچھا ہے۔ آنند شرما نے کسانوں کی سوسائٹی میں رہتے ہوئے نہ جانے کتنا کمایا ہوگا۔ چرنال میں اس نے کاشت کی جو زمین خریدی تھی وہ ضرور ناجائز کمائی سے خریدی ہوگی۔ پھر ایسے آدمی سے میں بھی کیوں نہ فائدہ اٹھاؤں۔ اس لئے میں نے آنند شرما سے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں یہاں اپنے شہر میں بہت مصروف ہوں، اپنے شہر سے باہر جانے کے لئے مجھے وقت نہیں ہے۔ تب وہ ضد کرنے لگا اور بولا ''وکیل صاحب آپ کو میرا کیس لڑنے کے لئے سیہور چلنا ہی پڑے گا۔ آپ جو بھی فیس مانگیں گے وہ میں دوں گا۔''

لوہا گرم دیکھ کر میں نے ہتھوڑا مار دیا۔ میں نے کہا ''چلو ٹھیک ہے میں وقت نکالنے کی کوشش کروں گا مگر میری ایک دن کی فیس تین ہزار روپے ہوگی۔''

آنند کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ تین ہزار روپے یومیہ کی فیس اس پر بھاری پڑ رہی تھی مگر وہ کسی بھی قیمت پر بری ہو جانا چاہتا تھا۔ اس لئے تھوڑی ہی دیر میں، اس نے ہاں کہہ دی۔ مگر میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ''ہاں'' کہتے وقت اس کا دل جیسے بیٹھ گیا تھا۔ لیکن یہ سب دیکھ اور سمجھ کر بھی میں نہیں پسیجا۔

میں جانتا تھا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر آنند شرما کا استحصال کر رہا تھا اور اس وقت میں ایک سنگ دل انسان تھا۔ لیکن اس کے پیچھے میری نفسیات کام کر رہی تھی۔ میری موجودہ نفسیات جو میرے ماضی نے بنائی۔ میرے بچپن کا ماضی ہر وقت میرے سامنے رہتا تھا۔ بچپن میں بڑے تکلیف کے دن گزرے تھے کیونکہ میرا باپ ایک غریب انسان تھا۔ اس کی سارے دن کی محنت مشقت کے بعد بھی ہم لوگ بھر پیٹ کھانا نہیں کھا پاتے تھے۔ میرے باپ موسم کی کڑکتی دھوپ میں اور موسم باراں کی گرجتی بارش میں قصبے سے دو کلومیٹر دور بس اسٹینڈ پر جا کر کنڈکٹری کرتے تھے اور سارے دن کی کمائی میں دس بارہ یا پندرہ روپے ہی شام کو گھر لاتے تھے۔ جس سے ہم پانچ بھائی بہنوں کا خرچ بمشکل چلتا تھا۔ ان دنوں میں دیکھتا تھا کہ قصبے میں کئی دکاندار اور کاشتکار بہت پیسے والے تھے جو خود تو عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے مگر میرے والد کو کسی ضرورت پر سو دو سو روپے بھی آسانی سے ادھار نہیں دیتے تھے۔ وہ سب دیکھ کر میں دولت مند لوگوں سے نفرت کرنے لگا تھا اور سوچتا تھا کہ جب میرا وقت آئے گا تو میں خوب دولت حاصل کروں گا اور دیکھ لوں گا ان دنیا والوں کو جو میرے سیدھے سچے باپ پر مہربان نہیں ہیں۔

مجھے بچپن میں موسیقی سے بہت لگاؤ تھا مگر اُن دنوں ہم ایک ریڈیو بھی نہیں خرید پائے تھے۔ ایک ریڈیو ہی کیا، زندگی کی دیگر ضرورتیں اور اور شوق بھی ہم پورے نہیں کر پاتے تھے۔ سال میں ایک بار موسمِ سرما کے دنوں میں جب قصبے میں میلہ لگتا تو میں میلے کی دکانوں میں باہر کے دکانداروں کے ذریعہ لائی گئی نت نئی چیزیں دیکھتا رہ جاتا لیکن ان کو خرید نہیں پاتا۔ میلے میں ٹورنگ ٹاکیز بھی آتا تھا۔ رات کو آٹھ بجے سفید کپڑے کی چار دیواری کے اندر کبھی ثریا اور رحمان کی فلم ''بڑی بہن'' تو کبھی بینا رائے اور کشور ساہو کی ''کالی گھٹا'' اور کبھی دھارمک فلم ''ویر گھٹوت کچ'' دکھائی جاتی تھیں اور ہم قصبے کے چند دوست یا تو باہر کھڑے اندر کے پردے تاک جھانک کر لیتے تھے یا پھر گیٹ کیپر کو دھکا کر اندر گھس جایا کرتے تھے۔

غرض، بچپن میں بڑی تنگی کے دن گزارے۔ پھر تعلیم حاصل کرنے اور وکیل بننے میں بہت سال لگ گئے اور یہ سارا وقت میرے لئے صبر آزما تھا۔ بہر حال بہت جدو جہد کے بعد میرا اچھا وقت آیا۔ وہ وقت کہ جب پھر کمائی ہی کمائی ہوتی ہے اور جدھر بھی اشارہ

کروتو روپیہ سر جھکائے چلا آتا ہے۔ جب روپیہ آیا تو میں نے شہر میں اپنا خود کا گھر بنایا، اپنے چھوٹے چھوٹے شوق پورے کئے لیکن میں کار نہیں خرید سکا تھا۔ جب دیگر وکیلوں کو میں کار چلاتا دیکھتا تو للچا جاتا تھا اور اپنی خود کی کار خریدنے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ اس لئے میں اپنے مؤکلوں سے زیادہ فیس حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں یہ بھی نہیں دیکھ پاتا تھا کہ زیادہ دینے کی حیثیت میرے مؤکل کی ہے یا نہیں اور بات وہی تھی کہ بچپن میں دنیا کو بے رحم دیکھا تھا تو بعد میں خود بھی دنیا کے لئے بے رحم بن گیا۔

ان ہی دنوں یہ آنند شرما میرے پاس آیا تو میں اس سے ہر پیشی کے روز تین ہزار روپے لیتا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ اس کے مقدمے کی پیشیاں بڑھتی جائیں اور میں اس سے رقم اینٹھتا جاؤں کیونکہ وہ تین ہزار روپے کی رقم یکمشت دیتا تھا جسے میں بینک میں جمع کر دیتا تھا۔ جب اس کے کیس سے میرا بینک بیلینس بڑھ رہا تھا تو میں اس کا کیس جلدی کیوں نپٹاتا اسلئے کسی نہ کسی بہانے میں اس کے مقدمے کی پیشیاں بڑھواتا جا رہا تھا۔

آنند شرما چہرے سے ہی بھلا آدمی لگتا تھا۔ کہتا تھا کہ غبن اس نے نہیں کیا بلکہ سوسائٹی کے ایک دوسرے ملازم نے کیا تھا۔ مگر میں نے اس کی بات کو کبھی سچ نہیں مانا، اگرچہ اس کی ہاں میں ہاں ضرور ملا دیتا تھا۔ شرما نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے کھیتی کی زمین اپنی بیوی کے زیور بیچ کر خریدی تھی جو اب مقدمے کے خرچ میں بکتی جا رہی تھی۔

اور پھر بعد میں مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ آنند شرما اب غبن کے مقدمے کی فکر سے زیادہ مقدمے کے خرچ کی وجہ سے فکرمند رہنے لگا تھا اور پریشانی میں شراب بھی زیادہ پینے لگا تھا۔ بلڈ پریشر اور ذیابطیس کی بیماریوں نے بھی اسے آگھیرا تھا۔ ایک بار سیہور جاتے ہوئے اس نے مجھ سے راستے میں کہا تھا "وکیل صاحب اب تو کبھی کبھی میرے دل میں بھی درد ہونے لگا ہے۔ میری پریشانیاں اور مقدمے کا خرچ دیکھ کر میری پتنی مستقل تناؤ میں رہتی ہے اور کبھی کبھی اسے زبردست دورے پڑتے ہیں۔ اس کو ڈر یہ بھی ہے کہ کہیں مجھے سزا نہ ہو جائے کیونکہ دستاویزی ثبوت میرے خلاف ہیں۔"

اس وقت میں نے دل ہی دل میں کہا تھا "سالا بن رہا ہے، نہ جانے کتنی رقم اوپر سے کمائی ہے۔ اب وہ خرچ ہو رہی ہے تو دونوں میاں بیوی کے دل بیٹھے جا رہے ہیں۔"

بالآخر مقدمے کا فیصلہ ہوگیا۔ اس پر لگایا ہوا الزام ثابت نہیں ہوا اور عدالت نے اسے بری کردیا۔ میں فیس بھی اس سے تقریباً ساٹھ ہزار روپے لے چکا تھا اور اس رقم میں کچھ اور رقم ملا کر میں نے سیکنڈ ہینڈ امبیسڈر کار خرید لی۔ آخری ملاقات میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ اگرچہ وہ نوکری میں واپس لے لیا گیا ہے مگر اب وہ نوکری نہیں کرے گا اور اس علاقے سے بہت دور اپنے وطن چلا جائے گا۔ اس روز پہلی بار اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ ایک اچھا آدمی تھا اور میں نے اس پر شکوک کچھ زیادہ ہی کر لئے تھے۔ ممکن ہے کہ سوسائٹی کا غبن بھی اس نے نہ کیا ہوگا۔ لیکن بس اس سے زیادہ میں نے کچھ اور نہیں سوچا اور جھٹ پٹ اس سے رخصت لے کر آگے بڑھ گیا۔ وکالت کے پیشے میں اس طرح کے کئی مؤکل آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

وقت کچھ آگے بڑھا۔ میں شرما کو قریب قریب بھول ہی گیا تھا کہ وہ مجھے خوابوں میں آکر پریشان کرنے لگا اور میری نیندیں اڑانے لگا۔ اس کی کہانی سن کر میری بیوی سندھیا کے چہرے پر رنج کے تاثرات ابھر آئے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی ''آپ نے Definitely (یقیناً) ہی آنند شرما کے ساتھ کرورتا (ظلم) کی تھی۔ اب یا تو وہ کرورتا کہ جو برسوں سے آپکی آتما میں چھپی بیٹھی تھی، آنند شرما کا روپ دھار کر آپکو سپنوں میں پریشان کر رہی ہے یا پھر آنند شرما اور اس کی پتنی کہیں بیٹھے ہوئے آپ کو کوس رہے ہیں۔ اس لئے آپ جایئے کہیں بھی اس کو ڈھونڈھ کر نکالئے اور اس سے معافی مانگئے۔''

میں نے بیوی کی بات مانی اور سب کام چھوڑ کر آنند شرما کا پتہ ٹھکانہ معلوم کرنے چل دیا۔ معلوم ہوا کہ آنند شرما اپنے کیس کے فیصلے کے بعد ہی اپنی بیوی اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ شملہ چلا گیا تھا جو اس کا آبائی وطن تھا۔ میں نے دیر نہیں کی اور شملہ کے لئے روانہ ہوگیا۔ شملہ میں اس کا صحیح پتہ معلوم نہ ہوسکا۔ بس صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہاں اس کے ماما نریندر شرما رہتے ہیں جن کی مال روڈ پر موسیقی کے ساز و سامان کی دکان ہے۔ شملہ میں مال روڈ پر جا کر میں نے وہ دکان معلوم کرلی۔ نریندر شرما بہت بوڑھے ہونے اور بیمار رہنے کے باعث اب گھر پر ہی رہتے تھے۔ دکان پر ان کا لڑکا ملا جس نے بتایا کہ آنند شرما خوب شراب پینے اور جگر خراب ہوجانے سے ایک سال قبل مر چکا ہے اور اس کی بیوی کا دماغ چل گیا ہے

جو اکثر بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔

میں نے آنند شرما کی بیوی نرملا دیوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ لڑکا شام کے وقت مجھے اس کے گھر لے گیا۔ یہ نرملا دیوی کے مرحوم والد کا گھر تھا۔ نرملا دیوی گھر کے اندر نہیں تھی۔ وہ گھر کے پچھواڑے آنگن کی فصیل پر بیٹھی تھی اور دو پہاڑیوں میں جلد ہی چھپ جانے کو بے تاب آگ کے گولے جیسے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہمارے قدموں کی آہٹ سنی تو ہماری جانب پلٹی اور بغیر کچھ بولے مجھے بہت غور سے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ساری رات نہ سوئی ہو۔ چہرہ زرد زرد، دُبلا دُبلا اور بیمار سا لگ رہا تھا اور آنکھوں کے حلقوں میں سیاہی اتر آئی تھی۔ کل ملا کر یہ کہ اس کا چہرہ ایک نیم پاگل عورت کا سا لگ رہا تھا۔

پھر مجھے قریب سے دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹھکی لیکن پھر جلد ہی بولی ”تم بھی مجھے جھاڑنے پھونکنے اور میرا دماغ ٹھیک کرنے آئے ہو لیکن تمہیں بھی اسفلتا (ناکامی) ہی ہاتھ آئے گی۔ مجھے ٹھیک کرنا ہو تو میرے آنند کو واپس لے کر آؤ۔ اس کی اسمے مرتیو (بے وقت موت) ہوئی ہے...... وکیل نے اسے مار ڈالا...... مجھے ٹھیک کرنا ہو تو اس وکیل کو پکڑ کر لاؤ...... میں اس کا نام نہیں جانتی۔ اس کا پتہ بھی بھول گئی ہوں...... تم خود جا کر ڈھونڈو۔ وہ ضرور تمہیں مل جائے گا، کسی نہ کسی کو بلی کا بکرا بنا رہا ہوگا۔ اس نے آنند کی ہتیا کی ہے...... اس پر جا کر کیس چلاؤ...... میرے پاس کیا رکھا ہے...... میں ٹھیک ہوں...... مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں تو بس موت کا انتظار کرتی ہوں۔ موت ایک دن ضرور آئے گی...... اور اگر نہیں آئے گی تو آنند آئے گا جو سامنے کے ان پہاڑوں میں جا چھپا ہے۔ سورج ابھی ابھی اسے ڈھونڈنے گیا ہے، جو ایک نہ ایک دن اسے میرے پاس لا کر ہی رہے گا......“

یہ کہہ کر نرملا پھر سے پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگی۔ سورج ڈوب چکا تھا مگر جاتے جاتے اپنی سرخی سے اس نے افق پر جو منظر بنایا تھا وہ بہت دلکش تھا۔ صرف عظیم لوگ اور عظمت سے بھرپور چیزیں ہی جاتے جاتے بھی کچھ وقت کے لئے اپنی مخصوص چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ آئے لڑکے نے اپنی ایک انگلی سے اپنے سر کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ نرملا کا دماغ چل گیا ہے۔ میں نے اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا اور پھر ہم لوگ

دبے قدموں سے گھر کے باہر آ گئے۔

میں نے شملہ سے آ کر اپنی بیوی کو سب حال سنایا۔ بیوی سن کر بولی ''آنند شرما کی آتما بے چین ہے۔ وہ آپ کو خوابوں میں آ کر تنگ کر رہی ہے اور آپ سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔'' تو پھر میں کیا کروں؟ میں نے پریشانی اور مایوسی کے عالم میں اس سے پوچھا۔ بیوی نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ''کسی بابا سے جھاڑ پھونک کرائیے اور اپنے اندر بُری آتما کے پربھاؤ (اثرات) کو ختم کرائیے''۔

''آنند شرما کی آتما بری نہیں ہے۔ بُرا تو میں ہوں''

''کسی کو ستانے والی آتمائیں بری ہی ہوتی ہیں'' بیوی نے کہا ''اور جو جھاڑ پھونک اور منتروں سے ہی پیچھا چھوڑتی ہیں۔''

میں خاموش ہو گیا۔ اور پھر بیوی کی بات مان کر اور ایک بڑی رقم خرچ کر کے سادھو سے اپنے اوپر جھاڑ پھونک کرائی۔ سادھو مہاراج نے مجھے یقین دلا کر کہا ''جاؤ پُتر، پریت آتما کے پربھاؤ سے تمہاری آتما کو مکتی مل چکی ہے، اب تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔''

میں بے فکر ہو کر اپنے کام کاج میں لگ گیا تھا لیکن میری بے فکری کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ خوابوں سے تب بھی میرا پیچھا نہیں چھوٹا۔ آنند شرما تو عموماً اب میرے خوابوں میں نہیں آتا تھا مگر دو چار دنوں کے وقفے سے ڈراؤنے خواب مجھے پریشان کرنے لگے تھے۔ اور اس طرح میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی اور اپنے مقدموں کو ٹھیک طرح پیروی کرنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ مقدموں میں گواہوں سے ٹھیک طرح جرح کرنا اور لمبی لمبی بحثیں کرنا اب میرے بس کی بات نہیں تی۔ رات میں گھنٹوں نیند نہ آنے سے دن کے وقت اکثر میرا سر دکھتا رہتا تھا اور یوں ذہنی طور پر میں بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ اگر آنند شرما زندہ ہوتا تو میں اس سے معافی مانگ لیتا اور اسے اس کی آدھی رقم واپس لوٹا دیتا۔ مگر وہ تو مر چکا تھا اور اس کی بیوی مسلسل پریشانیوں اور شوہر کی جدائی کے رنج کے باعث اپنا دماغی توازن کھو چکی تھی۔ اور اب مجھے بخوبی احساس اور اعتراف تھا کہ میں نے آنند کو اس کی زندگی میں مقدمے کے دوران اس کا معاشی استحصال کر کے ستایا تھا کیونکہ اس وقت وہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا، خوف زدہ تھا، سزا سے بچنا چاہتا تھا اور پوری طرح میری گرفت میں تھا اور

اس لئے میں نے اس کی ابتری سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ اور ایسا کر کے نہ صرف میں نے اپنے پیشے کے اخلاقی اصولوں کے خلاف کیا تھا بلکہ اس پر ظلم کرنے کا گناہ بھی کیا تھا۔

دن ہو یا رات، پچھتاوے کے جذبے کے ساتھ، اپنے خراب کرموں کا بوجھ دل ود ماغ پر اور حواس پر میں ہر وقت محسوس کرتا تھا۔

آنند شرما کا دکھی سا چہرہ خیالوں میں کبھی میرے ذہن میں آجاتا تو میں چونک پڑتا۔ ذہنی پریشانی کے باعث اب میں کبھی کبھی بڑبڑانے بھی لگا تھا۔ اکیلے میں بڑبڑاتا اور دوسروں کے سامنے غصہ کرنے لگتا۔ عدالت میں کبھی کبھی کسی پر اتنا غصہ کرتا کہ لوگ مجھے ٹال کر آگے بڑھ جاتے۔ لیکن میں بدمزاج مشہور ہوتا چلا گیا جس سے میرے کام پر بھی فرق پڑا اور پھر میری آمدنی بھی کم ہوتی چلی گئی۔ میری خوش مزاجی کب کی رخصت ہو چکی تھی اور میں ایک چڑچڑا اور سنکی انسان بن چکا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری ذہنی حالت دن بہ دن بگڑتی ہی جا رہی ہے اور ایسا لگتا تھا کہ آنند شرما کی روح مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کو رجوع کیا تو اس نے کہا کہ مجھے کوئی جسمانی یا دماغی بیماری نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر میں کسی اچھے ماہر نفسیات ڈاکٹر کو دکھاؤں جو یقیناً میری ذہنی حالت کو ٹھیک کر سکے گا۔

ان دنوں ویلور (جنوبی ہند) کے ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر ایم راجن کی شہرت انگریزی اخبارات کے ذریعے ہم تک آئی تھی۔ ویلور میرے شہر سے دو ہزار کلومیٹر دور ہے، کافی خرچ ہو جانے کا امکان تھا مگر میں نے سوچا کہ اگر میرا دماغ ہی ٹھیک نہ رہا اور میں دنیا کے لطائف محسوس کرنے کے قابل نہ رہا تو میری جمع پونجی میرے ہی کام نہ آسکے گی۔ اس لئے اپنے ماما کو ساتھ لے کر میں ویلور پہنچ گیا۔ تلوار کٹ باریک مونچھوں والا ڈاکٹر ایم راجن چالیس بیالیس سال کا یعنی میرا ہی ہم عمر تھا اور اسے دیکھ کر مجھے خوشی اس بات کی ہوئی کہ وہ چہرے سے ہی مجھے امراض سے ہار نہ ماننے والا نظر آیا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ پروفیشنل تھی۔ یعنی میرے مرض سے لڑنے سے پہلے وہ مجھے اپنا گرویدہ بنا لینا چاہتا تھا۔ اپنا گرویدہ بنانے والے ڈاکٹر اور وکیل ہی اپنے مریض اور موکل کو ایک لمبے عرصے تک اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر کو فکر مند لہجے میں اپنی موجودہ ذہنی حالت بتانے کے ساتھ ساتھ آنند شرما اور اس کے کیس کے بارے میں بھی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح میں نے اس کا

استحصال کیا اور پھر کس طرح وہ اور اس کی بیوی معاشی اور ذہنی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر جان لیوا Depression کا شکار ہو گئے۔

ڈاکٹر راجن مسکرا دیا۔اس کی مسکراہٹ میں فاتحانہ امید کی جھلک نظر آئی جو مجھے اچھی لگی۔تامل ناڈو کے لوگ جس لہجے میں ہندی اردو بولتے ہیں اسی لہجے میں وہ مجھ سے بولا۔

''وکیل صاحب،آپ گھبراتا کاہے کو ہے۔ہم نے ادھر بہت سے بھوت لوگ کو چلتا کیا ہے...... ہم آپ کو ایک دم چنگا کر دے گا جی...... ایک دم فٹ...... لیکن کچھ ٹائم تو لگے گا۔''

اس نے مجھے کچھ دوائیں لکھ کر دیں اور ایک دو ماہ میں ملتے رہنے اور اس کے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینے کا مجھے مشورہ دیا۔اس سے مل کر میں بہت مسرور ہوا کیونکہ اس سے مل کر مجھے لگا کہ مجھے اس سے ناکامی نہیں ملے گی اور وہ میرے ذہن سے ساری پریشانیاں نکال کر مجھے بھلا چنگا کر کے ہی دم لے گا۔

میں کبھی ایک ماہ میں تو کبھی دو ماہ کے وقفے سے اپنے شہر سے پتنی کے ساتھ جا کر ڈاکٹر راجن سے ملنے لگا۔وہ دوائیں کم دیتا تھا مگر مجھے وقت زیادہ دیتا تھا۔ادھر ادھر کی سارے زمانے کی باتیں۔اس کے پاس باتوں کا جادو تھا اور اپنے اس جادو سے وہ مجھے ہنسی خوشی کے گلزار میں پہنچا دیتا تھا۔لیکن وہ آنند شرما کے بارے میں کم ہی بولتا تھا۔

ڈیڑھ سال کے عرصے میں میرے ویلور کے کئی چکر ہو گئے تھے۔ویلور کے چکر لگاتے لگاتے میری معاشی حالت بہت کمزور ہو گئی اور یہاں تک کہ میری کار بھی فروخت ہو گئی۔لیکن میں ڈاکٹر راجن کو کیسے چھوڑ دیتا۔عزیزوں کی رائے تھی کہ ایک اچھا ماہر نفسیات ہی میرے دماغ کا ٹھیک علاج کر سکتا ہے۔مجھے خواب تو کم آتے تھے لیکن میں سوتے جاگتے آنند شرما کو نہیں بھلا پا رہا تھا۔اس کا غمگین اور شکایت بھرا چہرہ میرے سامنے آجاتا تھا۔یعنی اب تک نہ مجھے آنند شرما سے نجات ملی تھی اور نہ ذہنی سکون ہی حاصل ہوا تھا۔

موسم سرما کی آمد آمد کے دن تھے اور اس روز میں ڈاکٹر کے ملاقاتی کمرے سے باہر دیگر مریضوں کے ساتھ بیٹھا ہوا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔اس بار میں اکیلا ہی اپنے شہر سے آیا تھا۔اخبار پڑھتے پڑھتے بور ہو گیا تو اخبار پھینک کر ڈاکٹر کے مکان کو غور سے دیکھنے لگا۔ڈیڑھ سال کی مدت میں مجھے اس کے گھر میں بڑی تبدیلیاں نظر آئیں۔فرش پر

پرانے ٹائلس ہٹا کر سنگ مرمر بچھا دیا گیا تھا اور پرانی دیواریں اب مہنگے رنگ و روغن سے چمچما اٹھی تھیں۔ اور برآمدے میں لکڑی اور لوہے کی کرسیوں کی جگہ مریضوں کے لئے کین کے صوفے رکھ دیئے گئے تھے۔ اور مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ پہلے پہلے جب میں آیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ صحن میں چند گملوں کے سوا کچھ نہ تھا لیکن اب وہاں نرسری سے لائے گئے پودوں سے ایک باغیچہ جیسا تیار کرلیا گیا تھا جس میں ایک مالی ہمہ وقت مصروف نظر آتا تھا اور...... اور کمپاؤنڈ کے کونے میں پرانی کھٹارہ ایمبیسڈر کار کی جگہ نئی چمچماتی Honda City کھڑی ہوئی تھی جو بلاشبہ ڈاکٹر راجن ہی کی تھی۔

یہ تبدیلیاں دیکھ کر میں سوچنے لگا ''کیا یہ ڈاکٹر بھی لوگوں کے معاشی استحصال کی راہ پر گامزن ہے؟ اور کیا آنند شرما کی جگہ اب میں......''

اپنا نمبر آنے پر میں نے ڈاکٹر راجن سے کہہ دیا۔

''ڈاکٹر، یہ آنند شرما بھلے ہی میری جان لے لے لیکن اب میں ویلور نہیں آؤں گا کیونکہ اب میری جیب یہاں بار بار آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور ڈاکٹر برا نہ مانو تو میں صاف صاف کہنا پسند کروں گا کہ جس طرح میں نے آنند شرما کو Exploit کیا تھا اسی طرح تم بھی مجھے......''

ڈاکٹر راجن نے بہت سخت نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میرے چہرے سے اس نے میرے فیصلے کی مضبوطی کا اندازہ چند لمحوں میں ہی لگا لیا۔ پھر کہا۔

''تم ایک سینٹی مینٹل فول ہے مسٹر منوج...... آنند شرما کا روگ تم نے ہی پالا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ آنند شرما کی بربادی کا کارن تم ہے۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ تم کو زیادہ فیس دینے سے وہ اور اس کا بی بی Depresion کا شکار نہیں ہوا...... آئی ایم شیور...... ایسا تم نے سوچ لیا کیونکہ تم اچھا کھاندانی آدمی ہے...... اس کا پریشانی یہ ہوگا کہ ایک لمبے ٹائم تک کیس چلنے سے اور کیس کا رزلٹ کے بارے میں سوچتے رہنے سے آنند سرما ڈپریشن کا سکار ہو گیا اور ڈیپریسن کینسر کی طرح ہی ایک Killer Desease ہے۔ وہ اس سے لڑ نہیں سکا اور مر گیا۔ اس کا پتنی اس سے بھوت پیار کرتا تھا اس لئے اس کی جدائی کے گم میں اس کا Balance of mind ڈسٹرب ہو گیا۔ اور رہا Professional exploitation کا بات تو آج کے ٹائم

میں وہ اتنا کھاس بات نہیں رہ گیا۔ کیونکہ آج کا سوسائٹی میں ہر کوئی ہر کسی کو exploit کرتا ہے۔ آنند سرما نے بھی کیا ہوگا۔ آج کی economy میں اس کو ایک weapon بنا لیا گیا ہے۔..... وہ کیا بولتے ہیں..... ہتھیار..... تم ایک وکیل ہے اور realities کو جانتا ہے اور میری تھرا (طرح)، ہی ایک پروفیسنل ہے، اس لئے ہم سچ سچ بولتا ہے..... بُرا نہیں ماننے کا ہیں۔؟.....

''مگر یہ سب پہلے ہی کیوں نہ تم نے مجھے.....''

وہ مسکرادیا اور پھر مصافحے کے لئے اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا کر کہا ''اب تم جاؤ مسٹر منوج..... وش یو گڈ لک..... تم میری بات اچھی تھرا سمجھ چکا ہے، پھر کاہے کو بار بار.....

اس نے گھنٹی بجائی تو اگلا مریض فوراً ہی اندر داخل ہوگیا۔ پھر وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ خوش آمدید کہنے والی مسکراہٹ!

ہاں وہ بوڑھا کھوسٹ ہے

ہاں وہ تریسٹھ سال کا بوڑھا کھوسٹ ہے۔اس کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے ہیں اوراس کا چہرہ تھوڑے چُسے ہوئے آم کا سا لگتا ہے۔اس کے گلابی مائل گورے چہرے پر ہڈیوں کے ابھار کچھ زیادہ ہی ہو گئے ہیں اوراب وہ ہمیشہ تھکا تھکا سا اور زندگی کے ولولوں سے ریٹائرڈ سا لگتا ہے۔سماج میں وہ بزرگ سمجھا جانے لگا ہے اور محلے پڑوس کی ملنے جلنے والی تقریباً سبھی لڑکیاں اسے انکل کہنے لگی ہیں اوراس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی عمر کے مطابق ہی ہمیشہ سنجیدہ رہے۔یعنی بزرگوں جیسا۔تو ——؟

تو کیا وہ اپنے نئے نئے ارمانوں کا گلا گھونٹ دے جنھوں نے اب اس بڑھاپے میں ہی جنم لیا ہے اور جو بالکل نوجوانوں یا جوانوں کے ارمانوں جیسے ہی ہیں۔اب اگر اس کا جسم بہت جلدی سے بوڑھا ہو جائے تو وہ کیا کرے۔یہ نئے ارمان اس کے دل و دماغ میں جنم ہی نہ لیتے تو ٹھیک تھا۔لیکن اگر انھوں نے جنم لے ہی لیا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ اس کو تو اپنے ارمان دیکھنا ہیں، اپنا جسم نہیں اور چونکہ ارمانوں کا تعلق دل و دماغ سے ہوتا ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ ابھی اس کے اندر کا کچھ نہیں بگڑا ہے، باہر کی دیواریں بھلے ہی بگڑ جائیں۔باہر کی دیواروں کی اسے زیادہ فکر نہیں۔اس کا ''اندر'' تو مضبوط ہے اوراس کو اب بھی اپنے خون میں جوانی کے شعلے جلتے سلگتے محسوس ہوتے ہیں۔لہٰذا ابھی وہ جیئے گا۔جوانوں کی طرح جیئے گا اور جوانوں کی طرح جینا اس کا حق ہے۔

وہ ریلوے کی نوکری سے پانچ سال قبل ریٹائر ہوا تھا۔ریلوے میں وہ کلرک تھا۔ پہلے پہلے تو وہ دفتر میں بیٹھتا تھا، پھر وہ بکنگ کلرک بنا دیا گیا تھا اور ٹکٹ کھڑکی پر مسافروں کو

ٹکٹ بیچتا تھا۔ جب تک کھڑکی پر بیٹھ کر وہ مسافروں کو ٹکٹ بیچتا رہا تب تک اسے لگتا رہا کہ وہ ایک مشین یا روبوٹ ہے۔ جس کو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کو تو بٹن دبتے ہی اپنے ہاتھ پیر چلانا ہیں۔ صبح سات بجتے ہی اس کے لئے بٹن دبنا شروع ہو جاتے تھے۔ وہ گہری نیند میں سو رہا ہوتا تھا تو پتنی دمنیتی اسے نیند میں اور کبھی کبھی سہانے خواب دیکھتے میں جھنجھوڑ دیتی تھی۔

''اے اٹھو جی، اٹھو سہگل صاحب، کیا آج آپ کو کام پر نہیں جانا ہے، ساڑھے سات بجنے والے ہیں۔''

وہ گھبرا کر اور کبھی کبھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور بیوی کے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے جو گھڑی دیکھتا تو اس میں پونے سات یا سات بجنے میں دس پانچ منٹ کم ہی ہوتے تو وہ بیوی پر چلاّ پڑتا ''ابھی تو سات بھی نہیں بجے ہیں، پھر کیوں اٹھایا—''

''بجے نہیں ہیں لیکن بجنے والے تو ہیں۔ ریلوے کی اس نوکری میں پانچ منٹ کی دیری بھی نہیں چلتی، اس لئے آپ کو دس پانچ منٹ پہلے ہی اٹھ جانا چاہیے۔''

''اُف کیا مصیبت ہے'' وہ بڑبڑاتا ہوا مسہری سے اٹھتا اور ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے بھاگتا۔ پھر بغیر بھوک کے ہی ناشتہ کرتا اور پھر نیچے زینے کی دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ اترتا ہوا بھاگتا اور ریلوے اسٹیشن کے لئے بس پکڑتا۔ کیونکہ وہ تو روبوٹ تھا۔ زندگی میں اس کی اپنی مرضی کو کچھ دخل ہی نہ تھا۔ سارے دن اسے روبوٹ بنے رہنا پڑتا۔ اور شام کو جب وہ تھک ہار کر بے کار ہو جاتا تو پھر کسی کام کا نہ رہتا۔ شام کے وقت کلکتہ کے بازاروں اور تفریح گاہوں میں کس قدر رونق ہو جاتی ہے، کتنے سارے جوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے یا پھر ایک دوسرے سے سٹے ہوئے چلتے ہیں اور کتنی ہی جوان، خوبصورت اور پر کشش لڑکیاں اور عورتیں رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس راہ چلتے مردوں کے ارمانوں کو جگاتی ہوئی یا کبھی کبھی آنکھوں کو دعوت دیتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ لیکن...... لیکن ان دنوں تو وہ جیسے لوہے کا بنا روبوٹ تھا کہ جس کے آہنی شریر کے اندر دل و دماغ بھی آہنی تھے۔ نہ دل میں امنگیں جنم لیتی تھیں اور نہ وہ ارمانوں کے بادلوں میں اُڑ سکتا تھا۔ بس دنیا کی رنگا رنگی کو خاموشی سے دیکھتا رہتا تھا، کہ جیسے روبوٹ اپنی بے نور آنکھوں سے دنیا کو دیکھتا نظر آتا ہے۔

دل، دماغ اور آنکھیں جیسے سب کے سب لوہے کے تھے۔

یہ چکّر برسوں چلے۔ اٹھاون سال کی عمر تک وہ روبوٹ ہی بنا رہا۔ اور جب اسے نوکری سے سبکدوش کر دیا گیا تو پھر اس کا تعلق نوکری کے کسی بھی بٹن سے نہ رہا اور یکایک وہ روبوٹ سے انسان بن گیا۔ انسان بنا اور فرصت کی گھڑیاں ہاتھ آئیں تو آنکھوں میں انسان کی روشنی آئی، دل میں ارمانوں نے جنم لینا شروع کیا اور دماغ بھی تصورات کی اڑان بھرنے لگا ز۔ اپنی بیوی سے بیوفائی کرنے اور کسی غیر عورت کو اپنانے یا اپنا بنا لینے کا فیصلہ وہ ڈیڑھ دو سال کی سوچ کے بعد کر سکا۔ اپنی بیوی اب اس کے ارمان پورے نہیں کر سکتی تھی۔ اب وہ رنگین سپنے کسی باہر والی کے ساتھ ہی بُن سکتا تھا، کہ کسی عورت کا جسمانی اور جذباتی ساتھ ایک فطری بات بھی ہے۔ اور دیکھا جائے تو جب تک آدمی اس سب سے منہ پھیرنے نہ لگے تب تک عورت اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

اب جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتا تو باہر کے رنگین مناظر اسے پکڑتے اور اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کی دعوت دیتے۔ اس کا دل کرتا کہ اس کے پہلو میں بھی کوئی حسینہ ہو جو اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے ساتھ بے فکری سے گھومے پھرے اور اس کے اسکوٹر پر اس کے پیچھے اس سے سٹ کر بیٹھے اور ایک ہاتھ سے اس کی کمر پکڑے۔ لیکن یہ سب تو تبھی ہو سکتا تھا کہ جب تک اس کا جسم جوان، پرکشش اور ٹنچ تھا۔ جوان اور پرکشش مردوں کے ساتھ ہی تو لڑکیاں ہو جاتی ہیں اور ان کے شب و روز کو رنگین بناتی ہیں۔ بوڑھے یا بوڑھے ہوتے ہوئے مردوں میں بھلا ان کو کیا مل سکتا ہے؟ نہ جوانی اور نہ رومانس۔

اور اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بوڑھا ہوا تب اس کے جوان اور رنگین ارمانوں نے جنم لیا۔ کیونکہ جوانی کے دنوں میں ہر وقت کے کام نے اس کے جوان ارمانوں اور امنگوں کو جنم ہی لینے نہیں دیا لیکن کبھی تو ان کو جنم لینا ہی تھا۔ تو اب وہ کیا کرے؟ بوڑھے جسم کے جوان ارمانوں کی چاہت کو کس طرح پورا کرے؟ سڑکوں، چوراہوں اور تفریح گاہوں پر رنگین جوانیاں تو بھاگی چلی جا رہی ہیں اور ان میں سے کوئی اس کے لئے رکتی بھی نہیں۔ بس ایک نظر اسے دیکھتی ہیں اور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ان کو بوڑھا ہوتا ہوا جسم تو نظر آتا ہے لیکن اس کے بوڑھے ہوتے ہوئے جسم کے اندر مچلتے ہوئے جوان اور خوبصورت ارمان اور امنگیں کسی کو

نظر نہیں آتے۔ سب باہر کو دیکھتے ہیں، اندر کو دیکھنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا کہ کبھی کبھی بے کشش "باہر" کا "اندر" کتنا اچھا، خوبصورت اور پرکشش ہوتا ہے۔

کاش کہ کوئی اسے ایک موقع تو دے۔ تو وہ بتادے گا کہ وہ ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے، بلکہ اندر سے کس قدر جوان اور رومانٹک ہے۔ اور جمالیات کے معاملے میں اس کے خیالات کس قدر خوبصورت ہیں۔ لیکن قصور ان لڑکیوں کا نہیں، اس کے بدبخت جسم کا ہے جو بہت جلد باہر سے بوڑھا ہوگیا۔ اس سے نوکری کرانے والوں نے ہر ماہ روپے دے دے کر اور اس سے اچھی طرح کام لے لے کر اسے نچوڑ لیا، اسے بوڑھا کر دیا اور اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اسے دیا کم لیکن اسے سے لیا زیادہ۔ اسے اس قابل بھی نہ رکھا کہ کوئی خوبصورت ...... اور خوبصورت نہیں تو کوئی مناسب شکل وصورت کی جوان لڑکی اس کی جانب دیکھے تو دیکھنے کے بعد مسکرادے اور اس کے قریب آجائے اور اس سے دوستی کرلے اور......

ہاں نوکری نے اسے اتنا ضرور دیا تھا کہ اس کے دو بیٹے اچھی تعلیم حاصل کر کے اچھی نوکریوں میں لگ گئے اور خود اس نے پراویڈینٹ فنڈ کی رقم سے ایک اچھے علاقے میں اپنا خود کا ایک فلیٹ خرید لیا تھا۔ دونوں بیٹے کلکتہ میں ہی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور ہر ماہ اپنے والدین کو کچھ نہ کچھ دے جاتے تھے، معاشی پریشانی ذرا بھی نہ تھی۔ بلکہ سال میں ایک بار کسی نہ کسی ہل اسٹیشن کی سیاحت کر آنے کے بعد بھی رقم بینک میں بچی رہتی تھی۔ اپنی صحت کی طرف سے بھی وہ خوش نصیب تھا کہ ابھی تک کسی بڑی بیماری نے اسے نہیں گھیرا تھا۔ آج بھی وہ گھنٹوں بازاروں میں پیدل چل لیتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں اب اگر کوئی مسئلہ تھا تو وہ یہی کہ وہ اب ہر وقت تنہائی محسوس کرتا تھا۔ بیوی گٹھیا کی بیماری کے باعث معذور ہوگئی تھی اور چڑچڑی بھی ہوگئی تھی۔ وہ عمر میں اس سے پانچ سات برس کم تھی لیکن اب اس سے بھی زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ گھریلو امور میں کسی خاص ضرورت کے علاوہ تو وہ اس سے بات تک نہ کرتا تھا۔

وہ دراز قد اور گوری رنگت کا پنجابی تھا اور سفید لباس میں تو وہ اچھا بھی لگتا تھا، لیکن تھا تو وہ بوڑھا ہی۔ نہ صرف اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے بلکہ کلائیوں کے آدھے سے زیادہ سفید بال بھی اس کی پکی عمر کی چغلی کھاتے تھے۔ اس کی شخصیت میں اگر کوئی اس کا

دشمن تھا تو یہ اس کی پکی عمر ہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہی وہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ صبح صبح سو کر اٹھنے، ڈیوٹی پر جانے اور دن بھر کام کرنے کے علاوہ تو اب اسے ماضی کا کچھ یاد ہی نہ رہا تھا۔ اس کا ماضی رنگینیوں اور زندگی کی خوبصورتیوں سے عاری تھا۔ کوئی ایک رومانس بھی تو اس کی زندگی کی جھولی میں نہ آسکا تھا۔ کلکتہ میں لوگوں نے کیسے کیسے عیش اڑائے اور اپنی زندگی کو سیراب کیا لیکن ایک وہ تھا جو احمقوں کی طرح نیک نامی اور کردار کو مضبوط بنانے میں ہی لگا رہا اور نتیجہ یہ کہ وہ سب لوگ عیش اڑا چکے، زندگی سے اپنے حصے کی موج مستی اور موج مستی سے ملنے والی خوشیاں حاصل کر چکے، لیکن وہ کورا ہی رہا۔ اس کی زندگی کے کورے کاغذ پر افسوس کہ ایک بھی داغ نہ لگا۔ کوئی ایسا داغ کہ جس کے پیچھے ہمیشہ ہی ایک رنگین کہانی ہوتی ہے۔

نوکری کے زمانے میں اس نے دیکھا تھا کہ اس کے کئی ساتھی کسی نہ کسی لڑکی یا کسی عورت کے ساتھ چکر چلا لیتے تھے اور جو شام کے وقت شہر میں ادھر ادھر گھومتے دیکھے گئے تھے۔ لیکن ان دنوں اس پر یہی دھن سوار تھی کہ اس کا کردار مضبوط اور بے داغ رہے۔ وہ تو اب زندگی کی ڈھلان پر اور سارے مواقع کھو دینے کے بعد ایسا ہوا کہ اسے اپنے کردار کو بے داغ رکھنے پر پچھتاوا ہوا۔ جوانی کے دنوں میں کلکتہ کی رنگین راتوں میں شامل ہو گیا ہوتا اور کچھ رنگ رلیاں منائی ہوتیں تو آج اسے پچھتاوا ذرا بھی نہ ہوتا۔ لیکن اب وقت اس کے ساتھ نہ تھا اور اسے پیچھے چھوڑ کر اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

لیکن پچھلے کچھ عرصے سے اس میں خواہش جاگ رہی تھی کہ وہ جاتے ہوئے وقت کا تھوڑا سا دامن ہی تھام لے۔ چورنگی پر یا تفریح کے کسی مقام پر کوئی ایک حسینہ ہی ہاتھ آجائے اور اسے رومانس کے کچھ مواقع فراہم کرے تو پھر اسے زندگی سے کوئی شکوہ نہ رہے۔

اس کے پرس میں روپے ہوتے تھے۔ کسی شام وہ کسی بڑے ہوٹل میں چلا جاتا اور ڈائننگ ہال کے کسی کونے میں بیٹھ کر موسیقی سنتا رہتا اور وہسکی پیتا رہتا۔ پرکشش اور سیکسی عورتیں وہاں آتی تھیں لیکن اپنے جوان ساتھیوں کے ساتھ۔ بھلے ہی ان جوانوں میں بیشتر کالے اور سانولے ہوتے تھے لیکن وہ بھرے بھرے بازوؤں والے اور چوڑے چکلے سینے والے تھے اور ان کا پورا سراپا بہت مضبوط ہوتا تھا۔ اس کے پاس نہ بھرے بھرے مضبوط بازو تھے اور نہ اس کے سینے پر زیادہ گوشت تھا۔ اس کے تو گال بھی پچکے پچکے سے لگتے تھے۔ پھر

کوئی جوان اور خوبصورت عورت کیوں اس کے پاس آتی ۔ بے شک وہ ان کو اچھی شراب پلا سکتا تھا اور لذیذ کھانے کھلا سکتا تھا۔ لیکن اچھی شراب اور لذیذ کھانے تو وہاں آنے والے سارے ہی جوان مرد بھی کھلانے کو تیار تھے۔ پھر کیوں وہ اس بوڑھے کے پاس آتیں۔ بوڑھا آدمی تو عموماً دور سے ہی زندگی سے بے زار معلوم دیتا ہے۔ بھلا کسی بوڑھے کے ساتھ دل کی حسرتیں نکالی جاسکتی ہیں۔ جب وہ گہرائی سے اس معاملے پر سوچتا تو یہی نتیجہ اخذ کرتا۔ پھر بھی یہ اس کی فطرت ہو گئی تھی کہ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے کبھی ترچھی نظروں سے اور کبھی بہت غور سے پرکشش عورتوں کو اور ان کے نیم عریاں پرکشش جسم کو گھورتا رہتا تھا۔ لیکن ان کو دیکھ لینے کے علاوہ اس کے ہاتھ آتا کچھ نہیں۔ دل میں حسرتیں لئے ہی وہ ہر شام یا ہر رات اپنے گھر واپس لوٹتا۔

جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتا تو اداسیاں اسے گھیر لیتیں۔ وہ ماڈرن عاشقوں کی طرح ہی عورت کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا اور کسی خوبصورت اور پرکشش عورت کو اس عمر میں بھی بہت پیار کرنا چاہتا تھا۔ اسے یخ بستہ پہاڑوں پر اور پھولوں کے درمیان لے جانا چاہتا تھا، کیونکہ اب ہمیشہ تنہا رہتے رہتے وہ بہت ویران ہو چکا تھا۔ لیکن اچھی عورت اور اس کا ساتھ اس کے نصیب کے کسی حصے میں شاید تھے ہی نہیں۔ تو پھر۔؟

مایوسیوں کے زیر احساس اسے ایک روز ایک بات سوجھی۔

اچھی عورتیں بے شک کسی بوڑھے کو آسانی سے نہیں مل جاتیں، لیکن عورتیں بازارِ حسن میں بکتی بھی تو ہیں یعنی روپے دے کر تو انھیں حاصل کیا ہی جا سکتا ہے۔ اور بے شک وہ پیار تو نہیں دے سکتیں، لیکن ضرورت بھی کیا ہے ان سے پیار پانے کی۔ ان کا قرب، ان کا لمس تو کم از کم وہ پا ہی سکے گا۔ جوان عورت کے جسم کے لمس کے لئے تو وہ کب سے ترس رہا ہے۔ چلو وہی سہی۔ اس لمس کو پا کر شاید اس کے ذہن کو کچھ سکون مل جائے۔

اور پھر اس کے قدم سوناگاچھی کے اس بدنام علاقے کی جانب اٹھ گئے کہ جہاں دلوں کے نہیں جسموں کے سودے ہوتے ہیں۔ جہاں روپیہ پھینکنے پر من چاہی عورت منٹوں میں حاضر کر دی جاتی ہے۔ یہاں مسکراہٹیں خرید لی جاتی ہیں اور آوارہ اور بے چین دلوں کی بے قراری کو کچھ نہ کچھ تو قرار آ ہی جاتا ہے۔

خراب اور بدنام مقام پر جانے کے لئے اس کے قدم نہیں اٹھتے تھے لیکن کسی طرح وہ ایسے خراب علاقے میں پہنچ ہی گیا۔اور جس عمارت کے سامنے وہ کھڑا ہوا تھا وہاں دلال نظر آنے والے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ایک پستہ قد آدمی نے بتایا کہ اس بلڈنگ کی پہلی منزل کے پہلے فلیٹ میں ایک مہاراشٹرین عورت برادیل نمبر ۱۰ چلاتی ہے۔جس میں ملک کے سبھی صوبوں سے لائی ہوئی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہاں سودے ذرا مہنگے بھاؤ ہوتے ہیں لیکن یہاں آنے والے لوگ موالی نہیں بلکہ قرینے کے ہوتے ہیں۔

وہ زینہ چڑھنے سے قبل ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔مبادا کوئی پہچان والا ٹکرا جائے اور تبھی اسے لگا کہ یہاں آ کر تو سچ مچ ہی وہ پستی میں گرنے جا رہا ہے۔مگر عورت کے لمس کا Temptation جلد ہی اچھے خیال پر غالب آ گیا اور اس نے زینہ چڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

کوئی پہچان والا تو وہاں نہ تھا لیکن تھوڑی ہی دور پر دو آدمی کھڑے ہوئے اس کی جانب کچھ استعجاب سے دیکھ رہے تھے اور مسکرا بھی رہے تھے۔انھیں دیکھ کر وہ سہم گیا۔شناسا تو وہ قطعی نہیں تھے لیکن اسے دیکھ کر چلتے چلتے ٹھہر گئے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ دیکھو، اس بوڑھے کھوسٹ کو کیا ہو گیا ہے، اس کو بھی عورت کی ضرورت آن پڑی ——— حرام زادے کہیں کے۔عورت اور عورت کی جوانی پر بس اپنا ہی حق سمجھتے ہیں۔صرف اس لئے نا کہ وہ ابھی جوان ہیں لیکن ایک دن وہ بھی سالے بڈھے ہوں گے۔ میں تو اس عمر میں بھی یہاں تک آ گیا ہوں، وہ اوباش تو آ بھی نہ سکیں گے۔اس عمر میں کسی کھٹیا پر پڑے پڑے کھانس رہے ہوں گے۔میرے جیسے زندہ دل وہ کیا ہوں گے اور کوئی اور کیا ہوگا۔

تھوڑا سا بے شرم بن کر وہ زینہ چڑھ گیا اور دلال کے بتائے ہوئے فلیٹ میں بھی داخل ہو گیا۔اور پھر اپنی سفید پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور سامنے نظر آنے والے عجیب سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ایک دم بے شرمی کا ماحول تھا جسے دیکھ کر وہ سہم سا گیا۔

کمرے پر سرخ گولوں کے شیڈ سے چھن کر آنے والی روشنی بھی سرخ تھی۔اس روشنی میں سگریٹ کا دھواں تیر رہا تھا جو کمرے کے منظر کو تھوڑا دھندلا رہا تھا۔کمرے میں چھ یا سات موٹے موٹے اوباش قسم کے لڑکے اور اتنی ہی بجی سنوری اور تازہ پھولوں جیسی تازہ

چہروں کی ہنستی کھلکھلاتی لڑکیاں جو بیس سے پچیس سال کی عمر کی ہوں گی۔ ان میں سے کچھ لڑکے صوفے پر بیٹھے تھے اور کچھ کھڑے تھے۔ ان سبھی کے ہاتھوں میں یا تو شراب کے گلاس تھے یا سگریٹ سلگ رہے تھے۔ کچھ لڑکیاں ان کے برابر صوفے پر بیٹھی تھیں اور کچھ ان کی گود میں بیٹھی ان کو اپنے ہاتھوں سے سگریٹ یا شراب پلا رہی تھیں۔ سب کے سب خرمستیوں میں مشغول تھے اور بہت بے شرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا تو گیا تھا کیونکہ بے شرمی کا یہ کھیل اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لیکن اندر اندر دماغ کے اس حصے نے کہ جو یہ سب پسند بھی کرتا ہے، لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا۔ دماغ کے اس حصے نے سوچا کہ جوانیاں مہذب سماج سے دور تاریکیوں میں یہ سب نہ کریں گی تو پھر کیا کریں گی۔ جوانیوں پر پہرے اور پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے یہ جوان لوگ اس کی طرح پاگل تو نہیں کہ محض کردار بنانے اور کردار کی بلندی پر ہمیشہ ہی بیٹھے رہنے کی دھن میں اس طرح کی موج مستی سے اور خوشیوں سے منہ موڑ لیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ بھی ان لڑکوں اور لڑکیوں کے بیچ میں جا کر بیٹھ جائے اور اس موج مستی میں شامل ہو جائے اور اپنی سالہا سال کی پیاس بجھائے اور تنہائیوں کے اداس احساس کو اپنے اندر سے نکال پھینکے۔

اس کو دیکھ کر وہ سب بھی چونک گئے تھے۔ کیونکہ اس جیسے سرتاپا سفید بوڑھے کھوسٹ کی ایسے مقام پر آمد ایک دم غیر متوقع تھی۔ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی ادھیڑ عمر کی اور فربہ جسم کی نائکہ نے اس سے پوچھا۔

''چاچا بول کیا بات ہے۔ ادھر کیسے آیا۔؟''

بیٹھے ہوئے لڑکوں میں سے ایک تھوڑا ہنسا، پھر بولا ''ادھر کوئی کس واسطے آتا ہے۔''

''میڈم، ایک چھوکری چاچا کو بھی پیش کر دو۔'' دوسرا بولا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ اسی لڑکے نے پھر اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی سے مذاق کیا ''تم جائے گا چاچا کے ساتھ؟ چاچا بہت پیسے دے گا۔''

یہ سن کر قریب میں بیٹھی ایک دوسری لڑکی نے پہلی والی لڑکی سے مسکرا کر کہا ''لیکن بس پیسے ہی دے گا، اور تو کچھ دے گا نہیں۔ پوچھ لے چاچا سے۔''

اس پر ایک اور قہقہہ پڑا جس میں ادھیڑ عمر کی نائکہ کے علاوہ سبھی شامل تھے۔ وہ ان سب کو پھٹکار کر بولی۔ ''کائے کو چاچا سے مکھول کرتا ہے۔ چاچا چھوکری واسطے نئیں آیا ہے، وہ بجرگ آدمی ہے، تم لوگ سالا...... ''پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

''چاچا ان کی بات کا بُرا نئیں ماننے کا۔ یہ سالا پاگل لوگ ہے، بیوڑا باج ہے، تم اپنا کام بولو، کس واسطے ادھر آیا؟''

وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے سامنے بیٹھی ان عورتوں کی جانب دیکھا جو اس کے بڑھاپے کو کچھ حقارت سے دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ جیسے وہ بھانپ گئی تھیں کہ بڈھا کس مقصد سے آیا ہے۔ اس نے بہت حسرت سے انھیں دیکھا۔ وہ سب کی سب بھرپور جوان، پرکشش اور گداز جسم کی مالک تھیں۔ وہ جن جن کے پہلو میں بھی جاتی ہوں گی تو ان کو بہت مطمئن کرتی ہوں گی۔ لیکن وہ اس کے کس کام کی۔ وہ حرام زادیاں تو جوان جوان بوکڑوں سے ہی اپنی بوٹیاں نچوائیں گی۔ ان میں سے اگر کوئی اس کے پہلو میں آئی بھی تو اس کی ہنسی ہی اڑائے گی۔

''بول چاچا، کس واسطے ادھر آیا۔ ادھر ہمارا ٹیم کھوٹی کرتا ہے۔'' برادیل کی نائکہ نے اسے ٹوکا ''اور اگر کوئی چھوکری منگتا تو بول۔ اِن میں سے ایک کو باجُو کے کمرے میں لے کے جا، ہم کو تو بس پیسہ منگتا۔''

اب اور زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا اور اب اسے فیصلہ فوراً ہی کرنا تھا کیونکہ اسے دیکھتے رہنے میں کسی کو بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں سے نکالے اور اس موٹی سودے باز عورت سے کہا۔

''مجھے کوئی چھوکری نہیں چاہیے۔ تم دیکھتی نہیں کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ میں تو...... میں تو......''

اور پھر وہ اپنی بات مکمل کیئے بغیر دروازے کی طرف پلٹا اور تیزی سے نیچے زینے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

☆☆

بالجبر

مقدمہ بلاتکار (عصمت دری) کا تھا اور بہت سنسنی خیز تھا۔ وہ سنسنی خیز اس لئے نہیں تھا کہ وہ بلاتکار کا مقدمہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ بلاتکار ایک نوکر نے اپنے مالک کی بیوی کے ساتھ کیا تھا۔ مالک تھا ایک ہوٹل کا مالک، رادھے شیام رائے اور نوکر تھا، ایک پرانا اور وفادار نیپالی ملازم، بہادر۔

ملزم پر عدالت میں لگایا ہوا الزام کچھ اس طرح تھا۔

۳۱/اکتوبر کو دن میں قریب دو بجے کہ جب فریادی شوبھا رائے اپنے گھر میں اکیلی تھی، اس کے شوہر کا نوکر بہادر ہوٹل سے اپنے مالک کے لئے کھانا لینے گھر آیا تو اس نے شوبھنا رائے کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا اور اس کے ساتھ بلاتکار کیا اور اس طرح تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۷۶ کے تحت جرم کا ارتکاب کیا۔

ملزم کی ضمانت نہیں ہوئی تھی۔ اس دن کیس میں گواہی کی پہلی پیشی تھی۔ ملزم بہادر کو جیل سے ہتھکڑی میں عدالت لایا گیا اور دو سپاہیوں نے اسے کٹھرے میں کھڑا کر دیا۔ جج، سرکاری وکیل، ملزم کا وکیل، کلرک، ٹائپسٹ اور چپراسی سبھی مقدمہ شروع ہونے اور مقدمے کی کارروائی میں اپنا اپنا رول ادا کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے۔ مقدمے سے دلچسپی رکھنے والے لوگ مقدمہ سننے اور کارروائی دیکھنے کے لئے عدالت کی بینچوں پر ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ سبھی کو شوبھنا رائے کی آمد کا انتظار تھا۔ لوگوں کی نظریں عدالت کے دروازے پر تھیں۔ لیکن بارہ بج جانے کے بعد بھی وہ نہ آئی تو عدات نے ایک پولس والے کا بیان لینا شروع کر دیا جس سے حاضرین کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پولیس والے کا بیان شروع ہوتے ہی

شوبھنارائے اپنے شوہر کے ساتھ عدالت میں داخل ہوئی تو لوگ اسے اس طرح دیکھنے لگے کہ جیسے انہوں نے عورت ذات کو پہلی بار دیکھا ہو۔ پھر جب وہ اگلی صف کی ایک بینچ پر بیٹھ گئی تو اسے دیکھنے والے اس پر مسلسل نظریں جمائے ہوئے اپنے تخیلات میں کھو گئے اور اپنے دماغ کے پردے پر اپنے اپنے قیاس سے وہ سب مناظر بنانے لگے، جو شوبھنارائے کے ساتھ ہوئے جرم کے لئے وہ بنا سکتے تھے۔ وہ مناظر کہ کیسے نوکر بہادر گھر کے اندر آیا ہوگا اور کیسے اس نے شوبھنارائے کو پکڑ کر اسے بے بس کر دیا ہوگا اور پھر کیسے......

ملزم بہادر نے کٹہرے میں کھڑے کھڑے پہلی بار اپنی نگاہیں اونچی کر کے شوبھنا رائے کی جانب دیکھا اور تبھی شوبھنا نے بھی نظریں اٹھا کر پہلی بار بہادر کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو پھر شوبھنارائے کو بھی فلیش بیک کی طرح وہ مناظر یاد آگئے جن پر یہ پورا کیس مبنی تھا۔

وہ اپنے گھر میں تنہا ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی ہوئی ٹیلی ویژن پر ایک فلمی گیت کے مناظر دیکھ رہی تھی کہ تبھی بہادر گھر میں آیا۔ اس نے اپنے مالک رادھے شیام کے لئے اس سے کھانا مانگا۔ وہ کچن میں گئی اور وہاں سے کھانے کا ٹفن لے کر واپس ڈرائنگ روم میں آئی۔ پھر جیسے ہی اس نے کھانے کا وہ ٹفن بہادر کے ہاتھ میں دینا چاہا تو بہادر نے شوبھنارائے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شوبھنا نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر وہ کام یاب نہ ہو سکی تھی۔ ہمیشہ مسکین نظر آنے والا اور خاموش خاموش سا رہنے والا بہادر اس وقت یکا یک جنونی ہو گیا تھا۔ شوبھنا کے پاس پھر بھی ایک ہتھیار تھا جس کے استعمال سے وہ بہادر کو اپنے سے علیحدہ کر سکتی تھی اور بہادر کے خطرناک ارادوں سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکتی تھی۔ مگر اس نے اس ہتھیار کا استعمال نہیں کیا۔ وہ ہتھیار تھا اس کے اپنے دانت، جس سے اگر وہ اس وقت بہادر کو کہیں پر کاٹ لیتی تو وہ بلبلا اٹھتا اور یقیناً اسی وقت وہ اسے چھوڑ دیتا، کیونکہ نہ تو وہ غنڈہ تھا اور نہ ہی کوئی خطرناک آدمی۔ وہ عام نوکروں کی طرح ہی ایک معمولی انسان تھا، لیکن بس ایک جوان عورت کو تنہا دیکھا تو اس کے دماغ میں شیطان آ گیا اور پل کے پل میں ہی وہ اپنی راہ سے بھٹک گیا۔ آج بھی اسے یقین تھا کہ اگر اس روز وہ بہادر کے ہاتھ پر ہی کاٹ لیتی تو یقیناً اس کے دماغ سے سیکس کا بھوت فوراً ہی اتر جاتا۔ تو پھر اس نے بہادر کو کاٹا کیوں نہیں

تھا۔ کہیں...... کہیں اس لئے تو نہیں کہ بہادر کے ناپاک ارادے اسے اس وقت اتنے ناپاک نہ لگے ہوں اور وہ ان چند لمحوں کے اندر ہی بہادر کی خواہشات کی آگ میں خود بھی جل جانا چاہتی ہو۔ شاید......

اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟ کیوں اس نے وہ سب ہو جانے دیا...... کوئی خاص مزاحمت نہ کی...... اور پھر زنا بالجبر کا الزام بہادر پر لگوا دیا؟ اس فعل میں جبر کا الزام آتے ہی وہ قصوروار ہو گیا اور اب شاید سزا بھی پا جائے۔ بہادر کو سزا دلا دینا اب اسی کے ہاتھ میں تو ہے۔ جو آج وہ اپنے بیان میں کہے گی، وہی تو عدالت مانے گی۔ بہادر کی بات پر تو کوئی یقین کرے گا ہی نہیں، کیونکہ ایسے معاملوں میں مرد کی بات پر تو کبھی کوئی یقین کرتا ہی نہیں۔ بہادر کی وجہ سے ہی تو وہ بدنام ہو گئی۔ ابھی تو بہادر بس جیل تک ہی گیا ہے۔ ابھی نہ اس نے چکّی پیسی ہے، اور نہ وہ پہاڑ پر پتھر تڑوانے لے جایا گیا ہے۔ اگر وہ اس کو قصوروار ٹھہرا دے تو اسے سات یا پانچ برس کی قید بامشقت آسانی سے ہو جائے گی۔

لیکن کیا بہادر کا جرم ایسا تھا کہ اسے قید بامشقت کرا دی جائے۔ یہ تو عدالت میں بیان دینے سے قبل، اسے ابھی سوچنا ہوگا اور عدالت کے فیصلے سے قبل ہی اسے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا ہوگا۔ اور یہ فیصلہ کرنے سے قبل اسے اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ وہ کون سے حالات تھے کہ جن کے باعث وہ بہادر جیسے ایک معمولی نوکر کے سامنے ایک کمزور عورت بن گئی تھی۔

آج تو وہ ایک شادی شدہ عورت ہے لیکن دس سال قبل وہ شادی شدہ نہیں تھی۔

اور یہ کہانی شروع ہوتی ہے دس سال پہلے سے کہ جب وہ اپنی کم سنی کی عمر سے نکل کر سنِ بلوغ میں آ گئی تھی۔ اس نے اپنی عمر کے اکیس سال پورے کر لئے تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ہو گئی تھی۔

دس سال قبل اس کے پتا جی ایک غریب اور ایمان دار اسکول ماسٹر تھے۔ لڑکے والے اسے دیکھنے آنے لگے تھے، لیکن چونکہ وہ معمولی شکل و صورت کی تھی اس لئے کچھ تو اسے دیکھ کر جاتے تو پھر بات ہی آگے نہ بڑھاتے، اور کچھ ایسے تھے جو ایک بڑی رقم لے کر لڑکی کو اٹھانے کے لئے تیار تھے، مگر وہ رقم اس کے باپ کے پاس تھی کہاں۔ بینک میں بس اتنی ہی رقم تھی کہ شادی کا انتظام ہو جاتا اور تھوڑا بہت جہیز دے دیا جاتا۔ اور یہ بات وہ

لڑکے والوں سے صاف کہہ دیا کرتے تھے۔ لالچی لوگ خاموش ہو جاتے اور چلے جاتے۔ عجیب زمانہ آ گیا تھا۔ لڑکی چاہیے اور لڑکی کے ساتھ دولت بھی چاہئے۔ دوسروں کی لڑکی کو رقم حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا گیا تھا۔ ایسے سماج پر اس کے پتا کو بہت غصہ آتا تھا۔ وہ کہتے کہ لڑکی بھلے ہی کنواری بیٹھی رہے مگر کسی لالچی کو دہیز کے نام پر کوئی روپیہ ادھر اُدھر سے مانگ کر نہیں دوں گا۔ ادھار قرض لے کر اگر کچھ رقم دے بھی دی جائے تو کیا گارنٹی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پھر کوئی مطالبہ نہ ہوگا اور وہ لڑکی کو پریشان نہ کریں گے۔ شادی کے بعد پھر اگر کوئی مطالبہ ہوا اور رقم نہ ملی تو لڑکی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی جان بھی لی جا سکتی ہے۔ آج کا سماج دوسروں کی بیٹیوں کے لئے بہت ظالم ہو گیا ہے۔

ایسے حالات میں وہ قریب آٹھ سال تک کنواری بیٹھی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسکی جوانی کے دن گزرے چلے جا رہے تھے۔ رات کی تنہائیوں میں اس کے پتاجی آنسو بہاتے تھے۔ سماج کے لالچی لوگوں کو اور خراب نوجوانوں کو کوسا کرتے تھے۔ لیکن پھر ان ہی دنوں ایک بندہ ایسا آیا کہ جس نے جہیز میں اس کے پتاجی سے کوئی رقم نہیں مانگی اور نہ کوئی سامان ہی طلب کیا۔ وہ کھاتا پیتا آدمی تھا۔ کھاتا پیتا کیا دولت مند ہی تھا۔ اپنے خود کے ہوٹل سے روزانہ اس کی ڈیڑھ دو ہزار روپے کی آمدنی تھی۔ شہر کے وسط میں اس کا ایک ہوٹل تھا جس میں مٹھائی، نمکین، ٹھنڈا، جوس اور چائے سبھی کچھ ملتا تھا۔ رادھے شیام نام تھا اس کا۔ عیش و آرام کا ہر سامان اسے میسر تھا مگر ایک ہی خامی تھی اس میں کہ اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ یہی کوئی پچاس سال، ممکن ہے کچھ زیادہ بھی ہو، لیکن رادھے شیام نے پچاس ہی بتائی تھی۔ پتاجی نے کہا تھا کہ پچاس کی عمر کا آدمی بوڑھا نہیں ہوتا، ادھیڑ ہوتا ہے اور ادھیڑ آدمی اگر صحت مند ہو تو بہت مضبوط ہوتا ہے۔ رادھے شیام مٹھائی والا لالچی لڑکوں سے تو بہتر ہے اور پھر وہ ایک اچھی معاش والا مالدار آدمی ہے۔ اس کے گھر میں ہی شوبھنا سکھی رہے گی۔

اب سے دو سال قبل رادھے شیام کے گھر جا کر وہ سکھی تو رہی لیکن بس روپے پیسے اور گھر کے عیش و آرام کا سکھ ہی وہ پا سکی۔ زندگی کا سچا سکھ اسے نہیں ملا۔ جوانی مانگتی ہے جوانی کو۔ لیکن دولت کے نشے میں رادھے شیام اپنی جوانی کی دولت نہ جانے کہاں کہاں اور نہ جانے کس کس کو دے آیا تھا۔ کوئی جوان عورت اب اس کیلئے ایسی ہی تھی کہ جیسے کسی

بوڑھے کے پوپلے منہ میں سیب کی قاش۔ان معاملات میں تو رادھے شیام ایک مفلس ہی تھا جس کے گھر میں وہ پنجرے کی مینا بن کر رہ گئی تھی۔اور وہ اس دھرتی کی طرح تھی جہاں سے تھوڑی بہت بارش بس کبھی کبھار ہی گزرے۔پتاجی نے اسے کس کے پلے باندھ دیا تھا۔انہوں نے بس اپنے سر سے بلا ٹال دی تھی۔اگر پتاجی کے گھر میں رہتی تو ایک خوش نما بند کلی ہی رہتی،رادھے شیام جیسے کھوکھلے انسان کے گھر ایک ادھ کھلے اور بے رونق پھول کی طرح نہ ہوتی اور اپنی شادی کے سکھ کے لئے یوں ترستی نہ رہتی۔

وہ پڑوس کے دیگر شادی شدہ جوڑوں کو دیکھتی تو کبھی کبھی ایک سرد آہ اس کے منہ سے نکل جایا کرتی۔ان کے چہروں پر گلاب کے خوش رنگ پھولوں جیسی رعنائی چھلکی پڑتی تھی۔ان میں آپس میں کتنا پیار تھا۔کتنی زیادہ دیر تک وہ ایک ساتھ رہتے تھے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ ہمیشہ ہی کھیلا کرتی تھی۔یہ رادھے شیام تو صبح اٹھتے ہی اپنے ہوٹل کو بھاگتا تھا۔صبح کو جاتا تو پھر رات کے قریب بارہ یا ایک بجے نشے میں دھت آتا۔رات کا کھانا بھی عموماً کہیں سے کھا کر ہی آتا اور آتے ہی بستر پر گر جاتا۔شوبھنا اس کے پاس جاتی تو پھر کچھ ہی دیر میں گاؤں کی اس گوری کی طرح واپس لوٹتی جو موسم گرما کے کسی سوکھتے ہوئے کنویں سے اپنی گاگر کبھی خالی لے کر لوٹتی ہے تو کبھی قسمت سے تھوڑا بہت پانی اسے مل جاتا ہے۔

پیار کی پیاس کس بیاہتا کو نہیں ہوتی۔لیکن شوہر سے پیار یا سچا سکھ اسے کبھی نہ ملا۔اسے پیار دینے کے بجائے وہ عموماً اسے لتاڑ دیا کرتا۔بڑے کرخت الفاظ میں ایک بار اس نے کہا تھا"کیا رنڈیوں کی طرح مجھ سے آ کر جھوم جاتی ہے سالی۔سونے ہی نہیں دیتی......"

اور اس دن جب بہادر نے اس کے ساتھ زورزبردستی کی تھی تو وہ اسے دانتوں سے کاٹ کر الگ کر سکتی تھی۔مگر اس نے بہادر کو اس طریقے سے الگ نہیں کیا تھا۔جیسے ریگستان میں بہت دنوں تک پیاسا چلتے رہنے کے بعد یکایک کسی کے سامنے پانی سے بھرا کنواں آجائے تو جو حالت اس کی ہوتی ہے کچھ ویسی ہی حالت اس وقت اس کی بہادر کے اسے پکڑ لینے کے بعد ہوئی تھی۔بہادر کنواں تھا۔شوبھنا کو سیراب کیا تھا اس نے۔تب پھر وہ اسے دانتوں سے کیوں کاٹتی اور کیوں اسے اپنے سے الگ کرتی؟ ہوا یہ تھا کہ ایک بہت بک بک کرنے والی سندھی پڑوسن نے اچانک ہی گھر میں اور پھر اس کے کمرے میں داخل ہو کر

اسے دیکھ لیا تھا تو وہ بچاؤ بچاؤ کہہ کر چلا پڑی تھی۔ فوراً ہی پڑوس کے اور بھی کچھ لوگ آ گئے تو سب کے سامنے وہ مظلوم بن گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ پڑوسیوں نے بہادر کو پکڑ کر مارا تھا اور ٹیلیفون کر کے پولیس کو بھی بلوا لیا تھا۔ پولیس بہادر کو لاری میں بٹھا کر لے گئی تھی اور اب اس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ بلاتکار کا۔ عصمت دری کا۔ عورت کی رضا مندی کے خلاف جنسی فعل کے جرم کے ارتکاب کا۔ اگر وہ پڑوسن اچانک ہی اس دن اس کے گھر میں نہ آ جاتی تو اس کی عزت بھی داؤ پر نہ لگتی اور یہ مقدمہ بھی نہ چلتا۔

پھر کچھ دیر بعد ہی پولیس کے دو گواہان کے بیانات لئے جا چکے تو شوبھنا کو گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا۔ تب جج نے شوبھنا کو ہدایت دی۔ ''کہئے جو کچھ کہیں گی سچ سچ کہیں گی؟''

''میں سچ سچ کہوں گی اور سچ کے سوا......''

''یہ کب کی بات ہے...... میڈم شوبھنا رائے......؟'' سرکاری وکیل نے پوچھا۔

''یہ ۳۱ اکتوبر کے دن کے قریب دو بجے کی بات ہے''

''عدالت کے کٹگھرے میں کھڑے اس ملزم کو جانتی ہیں آپ؟''

''جی ہاں۔ جانتی ہوں— یہ میرے پتی کا نوکر بہادر ہے۔''

''اس روز کیا ہوا تھا؟ عدالت کو صاف صاف بتایئے۔''

شوبھنا رائے نے ایک بار پھر بہادر کی جانب دیکھا اور چند لمحے ٹھہر کر پھر کہا ''اس نے...... یعنی بہادر نے...... اس روز میرے ساتھ بُرا کام کیا تھا''

''بُرے کام سے مطلب؟''

''بُرا کام...... یعنی بُرا کام...... جسے بلاتکار کہتے ہیں......''

''یہ بھی بتایئے کہ وہ بُرا کام کیا ملزم نے آپ کی مرضی کے خلاف یعنی زبردستی بالجبر کیا تھا؟''

شوبھنا رائے نے عدالت میں بیٹھے حاضرین پر ایک نظر ڈالی، سبھی لوگ اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے بہادر کی طرف دیکھا۔ بہادر کو دیکھا تو وہ واقعہ پورا کا پورا پھر اسے یاد آنے لگا۔ شروعات بہادر نے کی تھی۔ بے شک شروعات اس کی مرضی کے

خلاف ہی کی تھی ...... لیکن اگر وہ اس سے الگ ہونا چاہتی تو اسے اپنے دانتوں سے کاٹ سکتی تھی۔ اور پھر اس سے الگ ہو کر گھر کے باہر بھاگ سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ بھاگی بھی نہیں تھی اور چلائی بھی نہیں تھی۔ بلکہ بہادر کے جنونی اور جنسی فعل میں اس کی شریک ہوگئی تھی۔ ایمان کی بات تو یہی ہے۔ اور وہ پڑوسن اگر اس وقت اچانک وہاں نہ آجاتی تو یہ بہادر نہ پکڑا جاتا اور نہ آج یہ مقدمہ چلتا۔ تب پھر شاید بہادر اس کا پریمی بن چکا ہوتا ......
بہادر نے تو اس جنم کی پیاسی کو کچھ دیا بھی تھا۔ مگر رادھے شیام نے تو اسے کچھ بھی نہیں دیا تھا ...... نہ پیار، نہ محبت، نہ سکھ ......

''میڈم ...... کیا سوچنے لگیں؟'' سرکاری وکیل نے کہا ''عدالت کو بتایئے کہ وہ بُرا کام ملزم بہادر نے کیا آپ کی مرضی کے خلاف کیا تھا؟''

وہ چونک پڑی اور اپنے خیالات کی دنیا سے واپس آگئی۔ سرکاری وکیل نے اس سے سوال کیا تھا اور اسے جلد ہی جواب دینا تھا۔ جج صاحب اس کی جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور پھر یکایک ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ ''جی نہیں ...... میری مرضی کے خلاف نہیں کیا تھا۔'' یہ کہہ جانے کے بعد فوراً ہی اسے ہوش آیا کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا۔ ان الفاظ سے تو اس کی اور اس کے شوہر کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن منہ سے نکالے گئے یہ الفاظ تیر کی طرح زبان کی کمان سے نکل چکے تھے اور اب واپس نہیں لئے جاسکتے تھے۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ ساری عدالت نے سن لئے تھے اور اب جج صاحب ان الفاظ کو اس کے بیان کے طور پر ٹائپ بھی کرا رہے تھے اور ان الفاظ کا فائدہ لینے کے لئے ملزم کا وکیل اپنے بدن پر گاؤن ٹھیک کر کے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ جوش دیکھا جاسکتا تھا۔

اور پھر اسے دھیان نہیں کہ سرکاری وکیل کیا کہہ رہا تھا اور ملزم کا وکیل کیا کہہ رہا تھا۔ ان دونوں میں ایک گرما گرم قانونی بحث چھڑ چکی تھی۔

☆☆

من کا چور

فرصت اس دور میں کہاں ہے۔ خصوصاً تجارت پیشہ کے یہاں تو مفقود ہی ہے اور دماغ؟ وہ بس کام کرتا رہتا ہے، مشین کی طرح، لیکن سوچ نہیں سکتا۔ کچھ سوچتا بھی ہے تو تجارت کے لیے۔ اپنے لیے اسے سوچنے کی فرصت نہیں۔ تجارت پیشہ کے لیے سوچ تو ایک گھاٹے کا سودا ہے۔ محض تضیع اوقات۔

لیکن اس نے دیکھا کہ کار میں چلتے چلتے، کہیں پر کھڑے کھڑے اور تنہائی کے کسی بھی موقع پر اس کے دماغ میں ایک نئی لیکن منفی سوچ کے انکور پھوٹنے لگے ہیں۔ وہ اس سوچ سے نظریں بچانا چاہتا ہے۔ لیکن سوچ ہے کہ کسی گرد آلود غبار سے نکل کر باہر آتی ہے اور اس کے عین سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک واضح تصویر کی طرح۔ اور خیالات جب واضح تصاویر کی طرح ذہن میں ابھرتے ہیں تو وہ ذہن کے پردے پر بھی منعکس ہونے لگتے ہیں۔

وہ نہیں چاہتا تھا اس بارے میں سوچنا، کہ یہ سوچ منفی خیالات کی حامل ہے۔ لیکن سوچ جب خود ہی ذہن پر یلغار کے لیے کمر بستہ ہو تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔

اس کی بیوی پانچ برس سے بیمار چلی آ رہی تھی۔ اختلاجِ قلب کے دورے پڑتے تھے۔ شروع میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ وہ ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔ لیکن بیماری نے جب شدت اختیار کی تو مزید جانچوں نے منکشف کیا کہ دل کے وال میں نقص پیدا ہو گیا تھا جو آپریشن سے دور ہو سکتا ہے لیکن اس آپریشن میں جان بھی جا سکتی ہے۔

بیوی نے سنا تو روئی۔ دنیا چھوٹنے کے غم میں کم، لیکن شوہر اور اپنی ایک بچی کی جدائی کا سوچ کر زیادہ۔ بہت محبت کرتی تھی وہ اپنے شوہر سے اور اپنی بچی سے۔ خیالات تصورات

کا روپ بھر بھر کر کروٹیں لینے لگے۔ آپریشن سے جی جائے گی تو زندگی بھر پیار نچھاور کرتی رہے گی اور نہ جیے گی تو زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو جائے گا۔ خلاء جسے کوئی اور نہ بھر سکے گا۔

لیکن...... خیال در خیال کا تسلسل جب دماغ میں چلا تو جس نئے خیال کے انکور پھوٹنے لگے وہ باغیانہ تھے۔ اس کی وفاداریوں کو کسی ہرے بھرے درخت کے ہرے ہرے پتوں سے یکا یک سوکھے پتوں میں تبدیل کر دینے والے۔ اور اس کے کردار کو ایک دو غلے انسان کے کردار میں بدل دینے والے۔ بے ایمان اور دو غلے انسان کے کردار اس نے زندگی میں کبھی پسند نہیں کیے تھے۔ اور یہ نیا خیال یا خیالات اسے ایک دو غلے انسان میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔

نئے نئے خیال سرگوشیوں میں نئی نئی باتیں کہنے لگے تھے۔ کہ اگر وہ آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہی ہے تو اسے جانے دو۔ یہ بھی تو ایک فطری فعل ہے۔ تم کیوں روکنے کی کوشش کرتے ہو اور ایسا کر کے قدرت کے معاملوں میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہو۔ جتنا کچھ دینا تھا وہ دے چکی، ان سترہ برسوں میں۔ اپنی محبت اور...... اپنی جوانی۔ ابھی اس کے پاس محبت تو ہے لیکن جوانی کہاں؟ بالکل بھی نہیں بچی ہے۔ جسم کیسا ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔ ایک دم بے رونق۔

اور...... اور ہاں، اب وہ سوشل بھی نہیں رہی۔ نہ کسی سے ملنے جاتی ہے اور نہ کسی کو اپنے یہاں بلاتی ہے۔ نہ پارٹیوں میں جاتی ہے، نہ پارٹیاں دیتی ہے۔ وہ وہ نہ رہی جو کبھی تھی۔ بہت زندگی تھی کبھی اس میں۔ اس کو ساتھ لے کر بہت گھومتی پھرتی تھی اور کیسے کھلکھلا کر ہنستی تھی اور اب تو بس گھر کی ہو کر رہ گئی ہے۔ منہ بسورے رہتی ہے اور کبھی اس کے ساتھ بداخلاقیاں اور بدتمیزیاں بھی کرتی ہے۔ گھر میں بعض ضروری کام کرتی ہے ورنہ باقی وقت بستر پر پڑی رہتی ہے۔ دل کے مرض کے علاوہ اور بھی امراض لگ چکے ہیں اسے۔ یعنی اب وہ صرف ایک مریضہ ہے۔ ایسی مریضہ جو اس سے پیار بھی کرتی ہے۔

لیکن پیار کرنے والی مریضہ اسے وہ سکھ تو نہیں دے سکتی کہ جس کی اب بھی اسے ضرورت ہے۔ وہ بوڑھا تو نہیں ہو گیا۔ اس کی امنگیں اور اس کے ولولے اب بھی جوان ہیں۔ اسے اب بھی ایک صحت مند ساتھی چاہیے۔ ایک بیمار بیوی اسے کیا دے سکتی ہے۔ بس یہ کہ اسے

وقت سے پہلے بوڑھا کر دے۔ بڑھاپے کی طرف بڑھتی ہوئی عورت اپنے شوہر کو بھی جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔ مرد مضبوط ہوتا ہے اور عورت کمزور۔ جلد راستے سے ہٹ جاتی ہے۔ یا پھر امنگوں اور ولولوں میں دیر تک اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

شادی ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ چلنے کا۔ ازدواجی زندگی کی گاڑی کو ایک ساتھ کھینچنے کا۔ جیسے دو بیل ایک گاڑی کو کھینچتے ہیں۔ ایک بیل بیٹھ جائے تو اسے بدل دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بھی اب بیٹھ گئی ہے۔ کیوں نہ اسے بدل دیا جائے۔ خوامخواہ جذباتی ہونے سے کیا فائدہ۔ جذباتی ہونا عورتوں کو ہی اچھا لگتا ہے۔ اور زیادہ محبت کرنا بھی عورتوں کا ہی کام ہے۔ مرد تو غیر جذباتی رہ کر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔

تو پھر — ؟

اس کا آپریشن نہ کرایا جائے؟ اور اسے اپنی قدرتی موت کی طرف بڑھنے دیا جائے؟ کچھ ظلم تو ہوگا یہ اور کچھ بے وفائی بھی ہوگی۔ اور یہ کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا کہ اپنی ہی بیوی سے یہ سلوک وحشیانہ ہوگا۔ لیکن شاید اب یہی ٹھیک ہوگا کہ اسی سے کچھ اس کا خود کا بھلا ہو سکتا ہے۔ یہ خود غرضی تو بے شک ہے لیکن آج کے اس دور میں خود غرض کون نہیں؟ یہ دور دراصل انسان کی خود غرضی کا ہی دور ہے۔ تو وہ بھی اگر تھوڑا سا خود غرض ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ کسی کو موت کی جانب دھکیلنا تو واقعی ایک بہت برا فعل ہے لیکن اگر وہ خود موت کی طرف بڑھ رہا ہو۔

اور کبھی کبھی جب اس کا ضمیر اسے کچوکے لگاتا تو ضمیر کے اشارے پر وہ اپنے آپ سے پوچھتا کہ کیوں وہ اپنی ہی بیوی کا دشمن بن بیٹھا ہے کہ جس نے اسے بے انتہا پیار کیا۔

لیکن جلد ہی اس نے اپنے ضمیر کا منہ بند کر دیا۔ اگر اپنے ضمیر کی بات مانے گا تو شبانہ کو کھونا پڑے گا۔ شبانہ اس کی پڑوسن ہے جو جوان اور خوبصورت ہے اور اس کے گھر میں آتی جاتی ہے اور اس سے خاصی بے تکلف بھی ہے۔ ایک عرصے سے اس کی نگاہ شبانہ پر ہے۔ اگر شبانہ پر اس کی نگاہ نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی بیوی سے بے وفائی پر آمادہ نہ ہوتا۔ لیکن وہ بھی کیا کرے۔ ایک جوان، صحت مند اور خوبصورت ساتھی کی چاہ ایک فطری بات ہے۔ اسے کچھ اپنے ساتھ بھی تو انصاف کرنا ہے۔

چونکہ وہ دولت مند ہے اور اپنے کاٹن کے پھیلے ہوئے کاروبار کا واحد مالک ہے اور عیش وعشرت کے بہت سے وسائل ہیں اس کے پاس، اس لیے بہت ممکن ہے کہ شبانہ اور شبانہ کا باپ اس جیسے ادھیڑ عمر والے کو قبول کر لیں۔ سودا ہے یہ تو۔ آج ہر کوئی اپنا نفع اور اپنا آرام دیکھتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے یہ گھاٹے کا سودا تو نہ ہوگا۔ بے شک اس کی عمر کچھ زیادہ ہے لیکن اس کے پاس دولت بھی تو زیادہ ہے۔ دس بیس سال میں اگر وہ مر گیا تب بھی وہ عیش کرے گی۔ تیس سال کی عمر تک شبانہ نے عیش نہیں کیے۔ لیکن اب تو کرے گی۔ پانچ برس قبل کسی سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ آدمی شرابی اور ظالم تھا۔ باپ نے گھر میں بٹھا لیا تھا اور طلاق بھی لے لی تھی۔ گدھا کہیں کا۔ باپ نہیں، شوہر۔ ایسی عورت کو پٹا کر رکھنا تھا۔ خیر، شاید وہ اس بد بخت کی قسمت میں تھی ہی نہیں۔ کیوں کہ شاید...... اب وہ اس کی قسمت میں ہے۔ یہ تو سب قسمتوں کی باتیں ہیں...... کہ چاندنی جا رہی ہے اور شبانہ آ رہی ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ بیوی سے بیوفائی کی اسکیم بناتے بناتے اسے بیوی پر ترس نہیں آیا۔ بہت آ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح کہ جیسے الزام ثابت ہو جانے پر ایک جج کسی کو پھانسی کی سزا سنا کر دل میں رنج کرتا ہے اور قلم کا نب توڑ دیتا ہے۔ اس نے بھی دل ہی دل میں بیوی کی موت کا فیصلہ کر کے قلم کا نب توڑ دیا تھا۔ اور نب توڑ کر اپنی اگلی اور پہلے سے خوشگوار زندگی کی اسکیم بنانے لگا تھا۔ کہ کس طرح شبانہ کو اپنا کر وہ اپنی نئی ازدواجی زندگی شروع کرے گا۔ اور اس کو لے کر کہاں کہاں جائے گا۔ نیپال، کوڈئی کنال اور دارجلنگ۔ اسے پہاڑ بہت پسند تھے۔ پرانی بیویاں عموماً پہاڑوں پر نہیں جاتیں۔ پہاڑوں پر انھیں متلی آنے لگتی ہے۔ گھاٹیاں بھی نہیں چڑھی اتری جاتیں اور وہاں کی سردی بھی برداشت نہیں ہوتی۔ پہاڑوں پر تو جوان عورتوں کا ساتھ ہی بھلا لگتا ہے۔ پھولوں کے مقام پر پھول جیسی عورتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ شبانہ نہ صرف خوبصورت اور سیکسی ہے بلکہ چنچل بھی بہت ہے۔ کھلکھلانے والی اس کی ہنسی وادیوں میں گونج گونج جائے گی۔ وہ تھک جائے گا لیکن شبانہ نہیں تھکے گی۔ صبح صبح اس سے بستر سے اٹھا نہیں جائے گا۔ تو وہ اسے اٹھائے گی اور کھینچ کر پہاڑوں پر لے جائے گی۔ سچ، بہت لطف آئے گا اس کے ساتھ۔

لیکن یہ سب تبھی تو ہوگا کہ جب چاندنی چلی جائے گی۔ اور چاندنی اس وقت

جائے گی جب اس کے دل کا آپریشن نہ ہو۔ دل کا آپریشن نہ ہوگا تو بھلا کب تک جیے گی۔ سال یا ڈیڑھ سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال۔ یا کبھی بھی ایک دو ماہ میں بھی۔ دل تو ایک بے وفا پرزہ ہے، جسم کی مشین میں۔ چاندنی کے دل کو جتنا خطرہ ہے اس کے بارے میں صرف وہی ٹھیک سے واقف ہے۔ چاندنی کو اس نے ٹھیک طرح خطرے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ چاندنی کو نہیں معلوم کہ موت اس کے دروازے پر ہی کھڑی ہے۔ وہ ٹل سکتی ہے کسی بہت اچھے ڈاکٹر کے آپریشن سے۔ لیکن وہ اس کا آپریشن کرائے تب نا!

''پھر...... کیا فیصلہ کیا آپ نے؟'' چاندنی نے ایک رات سونے سے قبل اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کس بارے میں؟''

''میرے دل کے آپریشن کے بارے میں''۔

''وہ نہیں کرانا ہے۔ آپریشن سے خطرہ زیادہ ہے۔ اس قسم کے کئی آپریشن فیل ہو چکے ہیں۔ تمھارے دل کا آپریشن نہ ہونا زیادہ بہتر ہے۔ اگر دل کا وال خود بہ خود ٹھیک نہ ہوا تو کم از کم دس پندرہ سال تو کوئی خطرہ نہیں۔ پھر بھی، آگے چل کر دیکھیں گے۔ گردے کی پتھری کی طرح شاید دل کا آپریشن بھی آسان اور بے ضرر ہو جائے۔ لیکن ابھی نہیں......''۔

شوہر کی دلیل میں وزن تھا۔ اور شوہر تو اس کا سب کچھ تھا۔ وہ جو سوچے گا تو ٹھیک ہی سوچے گا۔ پھر جتنی عمر لکھی ہے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ ڈاکٹر بھی نہیں اور دوائیں بھی نہیں۔

وہ خاموش ہو گئی اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ کاموں میں اور پھر عبادت میں۔

اور وقت گزرنے لگا۔ کبھی کبھی دورے پڑتے تھے چاندنی کو۔ وہ اتنا برا بھی نہیں تھا کہ ہر دورے پر یہ آس لگاتا کہ وہ چل بسے۔ اس نے تو یہ معاملہ قدرت کے ہی حوالے کر رکھا تھا۔ قدرت کو بہر حال وہ مانتا تھا اور ہفتے میں ایک بار والی عبادت بھی کیا کرتا تھا اور اسی بنا پر وہ اپنے آپ کو ایک اچھا آدمی سمجھتا تھا۔ خدا سے ڈرنے والا اور خدا کی بندگی کرنے والا۔

اور ایک رات چاندنی کے دل میں بہت تیز درد اٹھا۔ وہ اسے فوراً ہسپتال لے گیا۔ ایسا لگا کہ اب وہ نہیں بچے گی۔ وہ باہر بیٹھا تھا اور اندر آئی سی یو وارڈ میں ڈاکٹر مشینوں سے اس کی جانچ کر رہے تھے اور دوائیں دے کر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے

تھے۔ڈاکٹروں میں سے ایک نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔

''آپ کی بیوی اب بھی خطرے میں ہے۔بچ بھی سکتی ہے لیکن اگر دل کا آپریشن ہو جائے تو چانسیز (Chances) زیادہ ہیں۔اب فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے۔لیکن یہ آپریشن صرف ڈاکٹر پدم جی ہی کر سکتے ہیں جو شہر کے مہنگے ڈاکٹر ہیں۔''

اب زیادہ وقت نہیں تھا۔اور اپنا فیصلہ جلد سے جلد اسے ڈاکٹر کو سنا دینا تھا۔چند لمحوں میں ہی ایک بار پھر اسے سوچ لینا تھا کہ چاندنی چاہیے یا نہیں چاہیے۔اور شبانہ چاہیے یا نہیں چاہیے۔اگر شبانہ چاہیے تو چاندنی کو جانا ہی ہوگا۔

تو اب وہ وقت آ ہی گیا ہے کہ چاندنی اس دنیا سے جا رہی ہے۔چاندنی چلی گئی تو اس سے بیحد محبت کرنے والی گئی۔یعنی اس کی محبت گئی۔ارے حقیقی محبت کرنے والی بیوی کی جگہ کیا کوئی غیر عورت لے سکتی ہے؟ چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت اور پر کشش کیوں نہ ہو۔ چاندنی بوڑھی ہو رہی ہے تو کیا، وہ خود بھی تو بوڑھا ہو گیا ہے اور بوڑھا ہو کر بھی آوارگی کے لیے سوچ رہا ہے۔شبانہ کا خیال آوارگی نہیں تو کیا ہے۔اگر اس نے چاندنی کو مر جانے دیا تو یہ بڑا کمینہ پن ہوگا اور وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کر پائے گا۔

''اس کو بچانا ہے ڈاکٹر صاحب''اس نے تقریباً چلاتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا ''میری بیوی کو کسی بھی طرح بچانا ہے، چاہے کچھ بھی خرچ ہو جائے۔آپ فوراً ڈاکٹر پدم جی کو بلوائیے''۔

دوسری عورت

فرح گھر میں آئی تو جیسے سارا گھر اس کے گلابی گلابی چہرے سے اور اس کی مکمل شخصیت کی خوبصورتی سے منور ہوگیا۔ اور اداسیاں جو کہ پہلے گھر کے کونے کونے میں پاؤں پسارے بیٹھی تھیں، پھر سے اڑ کر کہاں گئیں، یہ کسی نے خوشیوں اور گہما گہمی کے دوران دیکھا ہی نہیں۔ حامد میاں کو امید نہیں تھی کہ اتنی اچھی دلہن ان کے ہاتھ آئے گی۔ اتنی اچھی دلہن انہوں نے اپنے بچپن میں صرف ایک بار دیکھی تھی۔ گئے وقتوں کے ایک جاگیر دار گھرانے میں کہ جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ ایسی ہی خوبصورت دلہن اب ان کو بھی مل جانا وہ اللہ کا کرم ہی سمجھتے تھے کیونکہ وہ خاندانی رئیس بھی نہیں تھے۔

بہر حال...... وقت ہر ایک کے لئے آگے بڑھتا ہے اور زندگی ہر گھرانے میں اپنے ہاتھ پاؤں پسارتی ہے۔ بیوی اچھی ملی تو حامد میاں کے بہت اچھے دن آگئے۔ کار سے دفتر جانا، وہاں شان سے ماتحتوں پر حکم چلانا، شام کو یار دوستوں میں دل بہلانا اور رات کو اپنی ملکہ کے ساتھ خوابوں میں سیر کرنا۔ بہت اچھی گزر رہی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سیدھی راہ چلتے تھے اور برے لوگوں سے بچتے تھے اور ہر ایک سے خوش اخلاقی سے بات کرتے تھے۔

پھر دو بچے ہوئے تو کچھ وقت ان کے ساتھ گزارتے اور کبھی کبھی ان کے ساتھ ہی بازار جاتے۔ یا پھر کسی اچھے مشاعرے میں چلے جاتے۔ اور کسی کسی اتوار کو اپنے گاؤں آتے۔ لیکن اپنے اس چھوٹے سے دائرے سے نہ کبھی وہ باہر نکلتے اور نہ زندگی کی کوئی اور دلچسپیاں ڈھونڈتے۔ اس دائرے میں گل تو تھے لیکن خاروں کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔

اپنے ایک مخصوص دائرے میں رہنے کے باعث ہی نہ کبھی انہوں نے کوئی پریشانی

دیکھی اور نہ زندگی کے کسی طوفانی تھپیڑے کا مقابلہ کیا۔زندگی کی گاڑی کے بندھے ٹکے راستے پر آرام سے چلتے چلتے شادی کے ٹھیک پندرہ سال بعد، روزمرہ کے معمول کی یکسانیت سے پیدا شدہ ''بوریت'' اور زندگی سے ''عدم دلچسپی'' کی ذہنی بیماری کا شکار ہو گئے۔ان کیلئے جانی پہچانی ہر شے اپنی کشش کھونے لگی۔ یہاں تک کہ کچھ رشتے بھی اپنی کشش کھونے لگے۔

اور کچھ عرصہ بعد تو ان کو محسوس ہوا کہ جیسے بیوی نے بھی اپنی کشش کھودی۔ بیوی پرانی پرانی سی لگنے لگی۔اس میں اب وہ پہلے جیسی پکڑ نہیں رہی تھی۔ پہلے تو زیادہ وقت گھر میں بیوی کے ساتھ ہی گزرتا تھا لیکن وہی وقت اب باہر دوستوں کے ساتھ گزرنے لگا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ ان کی دلچسپی عورت ذات سے ہی ختم ہو گئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ دیگر چیزوں سے ان کی دلچسپی بھلے ہی جاتی رہی ہو لیکن عورت کی مکمل شخصیت کو ہر زاویئے سے بخوبی جان لینے کے بعد، عورت میں ان کی دلچسپی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ پہلے کنوارپن کے دور میں وہ لڑکیوں یا عورتوں کی جانب دیکھتے ہی نہ تھے لیکن اب خوبصورت لڑکیوں یا عورتوں کی طرف ان کی نظریں اٹھ جایا کرتی تھیں۔اور صرف اٹھتی ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ان کے سراپے کا جائزہ کچھ اس طرح لیتے تھے کہ جیسے کوئی سنار کسی دوسرے کے بنائے ہوئے زیور کا جائزہ یہ جان لینے کے لئے لیتا ہے کہ زیور میں اچھا سونا کتنا ہے اور بھیل کتنا ہے۔اسی طرح حامد میاں اب خوبصورت عورتوں کے سراپے میں یہ دیکھنے لگے تھے کہ کیا واقعی ان میں کشش ہے اور اگر ہے تو وہ کہاں کہاں ہے۔

لیکن بیوی میں اب کچھ دیکھنا یا سمجھنا باقی نہیں رہ گیا تھا۔تازہ پھولوں کی رعنائی کی طرف سبھی لوگ متوجہ ہوتے ہیں لیکن باسی یا مرجھائے ہوئے پھول کسی کی بھی توجہ اپنے جانب نہیں کھینچ سکتے۔ بیوی فرح اب باسی پھول جیسی ہی تھی کہ جس میں رعنائی اب نام کو نہ تھی۔

اور پھر دھیرے دھیرے حامد میاں کے دماغ میں ایک اور خیال گھر کرنے لگا۔ ایک خطرناک خیال۔ان کے جیسے شریف اور بیحد مہذب آدمی کے لئے یہ خیال خطرناک ہی تھا۔لیکن وہ کرتے بھی کیا، یہ خیال تو برسات کے دنوں کے پھلتے پھولتے پودے کی طرح ان کے ذہن میں پھیلتا ہی جارہا تھا۔نہ اس خیال کی آمد کو وہ اپنے ذہن سے جھٹک سکتے تھے اور نہ اس کی نشوونما کو وہ روک پارہے تھے۔ بالآخر انہوں نے ٹھان لی کہ جو سوچا ہے وہ کر

گزریں گے۔

لیکن......لیکن......

کیسے ہو یہ جوکھم بھرا کام۔ کیسے وہ اپنے اندر ہمت کو مجتمع کریں اور کیسے اس دوسری عورت کی طرف پھندہ پھینکیں۔ اور جب وہ اس کی اسیر ہو جائے تو اس کو لیکر جائیں کہاں؟ اور وہ دوسری پرکشش عورت ہو کون؟

سوچتے سوچتے معاً انہیں غزالہ کا خیال آ گیا۔ غزالہ ان کے محلے کے بعد ہی ایک دوسرے محلے میں اپنی ماں اور دو بہنوں کے ساتھ رہتی تھی اور دور کے رشتے سے ان کی رشتے دار بھی تھی۔ اور جلد بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی اور سیکسی بھی تھی۔ اس کا Affair بہت مشہور ہوا تھا جس کے باعث وہ خاصی بدنام بھی ہوئی تھی۔ جس لڑکے کو وہ چاہتی تھی وہ اس سے سنہرے وعدے کر کے نوکری پر دبئی چلا گیا تھا لیکن جب تین سال بعد کچھ رقم کما کر لایا تو اس نے ایک دیگر زیادہ خوبصورت اور نسبتاً کم عمر لڑکی سے شادی کر لی۔ اس بدنامی کے بعد پھر غزالہ کی شادی ہو ہی نہ سکی تھی۔ لیکن اس بات کا غزالہ کو کوئی رنج نہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی سے دوستی رکھتی تھی اور اپنا دل بہلاتی تھی۔ اور اس وجہ سے بھی اس کی بدنامی میں اضافہ ہوا تھا۔

حامد میاں کو غزالہ نے ہمیشہ ہی بہت چاہت کی نظروں سے دیکھا تھا۔ کبھی ان کے گھر آ جاتی تھی اور کبھی ان کی کار میں لفٹ لے لیتی تھی اور ایک بار تو وہ دونوں میاں بیوی کے ساتھ پکچر بھی گئی تھی۔ لیکن حامد میاں کبھی خاص دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ حالانکہ گھر کے باہر وہ کچھ بھی کر سکتے تھے کیونکہ بیوی کو اپنے بیحد شریف اور سیدھے سچے میاں پر بہت بھروسہ تھا لیکن تب وہ اپنی بیوی کے لئے ایک باوفا مرد تھے۔ اور اب۔؟ شادی کے پندرہ سال بعد وفاداریاں متزلزل ہو رہی تھیں۔ عورت کا وہ جادو کھینچ رہا تھا جو اب فرح میں نہ تھا لیکن جو کنواری اور سیکسی گداز جسم والی غزالہ میں اب بھی تھا۔

تو کیوں نہ اب غزالہ ہی......؟

اور یوں غزالہ ان کے دماغ میں آئی اور ذہن کے کسی کونے میں آ کر بیٹھ گئی اور پھر دوسری عورت کے میل جول کا خیال اگر شیطانی خیال ہے تو ان کے دماغ نے شیطانی باتیں ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان شیطانی باتوں میں تو بابا کشش ہی کشش تھی۔ مرد اگر

بھٹک جائے تو پھر اسے گھر کے باہر ہی کشش نظر آتی ہے اور برائی ذرا بھی نظر نہیں آتی۔ جوانی میں اگر جوانی کے کھیل نہ کھیلیں گے تو کیا گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔ دماغ پھر اسی طرح سوچتا ہے۔ وہ سچ مچ بھٹک گئے تھے اور بیوی سے تھوڑی سی بیوفائی کرنے کا دل ہی دل میں فیصلہ کر چکے تھے۔ آج کے دور میں لوگ اتنے پارسا ہوتے کہاں ہیں۔ انہوں نے سوچا۔ خود ان کے کئی شادی شدہ دوست کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی چکر چلاتے رہتے ہیں اور وہ سب ادھیڑ عمر میں بھی بہت خوش اور زندہ دل ہیں اور ایک وہ ہیں کہ جن کو خواہ مخواہ مایوسیوں نے اور بوریت نے گھیر رکھا ہے۔ یکسانیت سے پیدا شدہ مایوسیت کا علاج شاید یہ دوسری عورت ہی ہے۔ بڑے شہروں میں بھی بہت لوگ دوسری عورتوں کا چکر پالے رہتے ہیں اور اپنی زندگی سے بہت مطمئن رہتے ہیں۔ یہ راز انہوں نے بہت دیر بعد سمجھا۔ ارے بھئی غزالہ ہی تو میرا علاج ہے۔ اسے اب بس جلد ہی پکڑنا چاہیے۔

اس فیصلے کے بعد غزالہ سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ دفتر جاتے ہوئے انہوں نے ایک دن اسے سڑک پر کار روک کر لفٹ دی۔ وہ شاید آٹو رکشا کے انتظار میں تھی اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی رنگین چھتری لئے ہوئے تھی کیونکہ آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش کسی بھی وقت آسکتی تھی۔ انہوں نے کار کے دائیں جانب کا دروازہ کھولا۔ جب وہ بہت خوشی خوشی اندر آ کر بیٹھ گئی تو گیئر ڈالتے ہوئے وہ مسکرا کر بولے۔

"یہ صبح صبح کہاں......؟"

"آپ تو اپنی شاہی نوکری پر جا رہے ہیں لیکن ایسے نصیب ہمارے کہاں۔ ہمیں آئے دن پرائیوٹ نوکریاں بدلنا اور ڈھونڈنا پڑتی ہیں۔ آج پھر ایک اسکول جا کر ٹیچر کی جاب کے لئے بات کرنی ہے"۔

کون سا اسکول ہے وہ۔ شاید میں مدد کر سکوں"

"ٹیگور اسکول۔ چلئے آپ کو ہمارا خیال تو آیا۔ شکریہ"

"شکریہ کی کیا بات ہے غزالہ، تم کوئی غیر ہو کیا"۔

"غیر تو نہیں ہیں، لیکن آپ نے غیر سمجھ رکھا ہے، جبھی تو کبھی آپ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ ہم کس حال میں ہیں"۔

''کچھ تو تمہاری غلط فہمی ہے اور کچھ ہمارا تغافل بھی ہے۔لیکن تغافل کیلئے ہم کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔اب ہم تمہیں ایسا محسوس نہیں ہونے دیں گے''

''وعدہ......؟''

''وعدہ۔شام کو پانچ بجے میرے دفتر آ جانا۔وہاں سے سیدھے اس اسکول کے سیکریٹری کے پاس چلیں گے۔سمجھو تمہاری نوکری پکی۔''

''شکریہ''

''پھر شکریہ۔یہ میرا فرض ہے ڈیئر''

''ساری۔میں پانچ بجے دفتر آ جاؤں گی۔پانچ سے پہلے چلے مت جانا''۔

''نہیں جاؤں گا۔تمہارا انتظار کروں گا۔''

''یہاں مجھے اتار دو۔اب میں اسکول نہیں جاؤں گی۔بازار سے کچھ سامان خرید کر واپس گھر جاؤں گی اور پانچ بجے پھر تمہارے پاس......''

وہ کار سے اتر گئی۔لیکن حامد میاں کے دل میں تو جیسے بیٹھی کی بیٹھی ہی رہ گئی۔اب دفتر میں اس کا شام تک بے چینی سے انتظار کرنا تھا۔اگر وہ نہ آئی تو......؟انہوں نے محسوس کیا کہ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ دوسری عورت کی شدید ضرورت ہو جاتی ہے۔وہ ضرورت اب ان کو تھی۔

وہ کہتے ہیں نا کہ کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آتے ہیں۔اسی طرح شام کو غزالہ حامد میاں کے دفتر وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئی۔اس کو بھی نوکری سے زیادہ حامد میاں کی ضرورت تھی۔کیسا مضبوط مرد ہے۔معاشی طور پر اور جسمانی طور پر۔پہلی بے تکلف ملاقات میں ہی غزالہ سمجھ گئی تھی کہ حامد میاں کو اس کی ضرورت ہے۔آدمی کی گفتگو کا انداز، لب ولہجہ اور نظریں بتا دیتے ہیں کہ کسی عورت کے تئیں اس کی نیت کیسی ہے۔وہ جان گئی تھی کہ حامد میاں کی نیت اچھی نہیں تھی۔ضرور بیوی سے اب ان کا دل بھر گیا ہے۔چلو اچھا ہی ہے۔اس طرح کے شادی شدہ مردوں کے رومانس میں تو بہت مزہ ہے۔پرانے مگر اچھے کھلاڑی ہوتے ہیں وہ۔

حامد میاں کا اور غزالہ کا ساتھ ہوا۔دونوں شام کو کسی نہ کسی ہوٹل میں چلے جاتے۔

کچھ کھاتے پیتے اور لوٹ آتے۔ آگے بات کرنے کی یا تنہائی میں اسے لے جانے کی ہمت نہیں تھی کیونکہ اس معاملے میں وہ کورے تھے۔

ایک شام ہوٹل میں غزالہ خود ہی بولی ''اس اتوار کو تو کہیں لمبا چلتے ہیں شہر سے باہر۔ حلالی ڈیم یا پھر......''

''کہیں اور کیوں، چکلود کے جنگل میں ہمارے کھیت ہیں اور کھیتوں کے بیچ ہمارا ایک چھوٹا سا گھر بھی ہے جہاں کھانا بھی مل جائے گا''۔

''تو پھر وہیں چلتے ہیں۔ کچھ آب و ہوا تو بدلے۔''

غزالہ نے خود ہی مشکل آسان کردی تھی۔ اب تو ان کی مراد بر آئے گی۔ ہاں وہ ہو گی اور......

اور اگلے اتوار کی رنگ بھری صبح کو حامد میاں کی کار میں غزالہ تھی اور کار سید ھے ان کے فارم ہاؤس جا رہی تھی۔ کوئی چالیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے۔

''کیوں، کیسا لگ رہا ہے یہاں جنگل میں۔؟'' حامد میاں نے غزالہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھا۔ جیسے کسی قید سے نکل آئے ہوں۔''

''لیکن مجھے تمہارا یہ لباس اچھا لگ رہا ہے۔ جیسے جنگل میں گلابی گلابی پھول کھل اٹھے ہوں''

آپ کو بس ہمارا لباس ہی نظر آیا، ہم نظر نہیں آئے''

''آپ کے بارے میں کچھ کہیں گے تو گستاخی نہ ہو جائے گی۔؟''

''ارے کیا بات کرتے ہیں آپ بھی۔ ہم تو اب آپ کے ہیں۔ کچھ بھی کہئے''۔

''اگر اجازت ہو تو ہم کہیں گے کہ آج آپ اتنی خوبصورت لگ رہی ہیں کہ......

......جی چاہتا ہے......

''کیا جی چاہتا ہے...... کہئے نا......''

''جی چاہتا ہے کہ (گا کر) ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے......''

غزالہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ پھر بولی ''ایسا کمرہ ہے کوئی ادھر۔ اس جنگل میں''؟

''ہے تو مگر پکے گھر کا نہیں ہے، کچے گھر کا ہے''

''کوئی دیکھ تو نہیں لے گا......؟''

''کیوں۔ڈر لگتا ہے......؟''

''ڈر اور مجھے۔ڈر لگتا تو آتی ہی نہیں۔لیکن کوئی ادھر اُدھر سے جھانکے تو کیا اچھا لگے گا''۔

''اجی کس کی مجال ہے جو ہمیں دیکھے۔آپ بے فکر رہیں......ذرا ہمارے نزدیک تو آیئے......''

باتیں کرتے ہوئے اور جنگل کا نظارہ کرتے کرتے وہ فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ کھیت پر بنے مکان پر ایک بوڑھا رکھوالا سندر لال موجود تھا۔حامد میاں نے اسے بیس روپے کا ایک نوٹ دیا اور فرج میں رکھے انڈوں کے آملیٹ فرائی کر کے لانے کو کہا۔اور پھر وہ دونوں کھیت کے ایک طرف کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گئے۔جھاڑیوں کے آگے نالا تھا جو برسات کا موسم ہونے سے پتھروں کی زمین پر کل کل کرکے بہہ رہا تھا۔

''ارے کتنا اچھا لگتا ہے یہاں، آپ کے اس گاؤں میں''

''ہماری بیوی کو تو یہ سب پسند ہی نہیں اور اس لئے وہ یہاں آتی ہی نہیں''۔

''اپنا اپنا ذوق ہے''۔

''مجھے خوشی ہے کہ تمہارا ذوق اچھا ہے''۔

''لیکن آپ نے بہت دیر سے جانا''۔

''دیر آید درست آید بھی تو ایک بات ہے''۔

''ہاں وہ تو ہے......''

فاصلوں کو قربتوں میں بدلنے کی ہمت اب بھی حامد میاں میں نہیں تھی۔پہلی بار ممنوعہ علاقے میں قدم رکھا تھا۔دل کہتا تھا کہ آگے بڑھو اور اسے بانہوں میں لے لو۔لیکن نہ قدم اٹھتے تھے نہ ہاتھ۔کیونکہ اندر اندر ایسا لگتا تھا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔لیکن پھر غزالہ نے ہی مشکل آسان کی۔وہ بولی ''یہاں کچھ سردی سی ہے۔چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں''۔

''ہاں چلو اب اندر ہی بیٹھیں گے۔''

اندر کمرے میں سندر آملیٹ اور ڈبل روٹی لے آیا۔ پھر حامد میاں نے سندر سے کہا کہ وہ گاؤں جائے اور کچھ اور انڈے لے آئے۔

سندر چلا گیا تو پھر تنہائی ہی تنہائی تھی۔ ایک نے دوسرے کو روٹی کے نوالے بنا کر کھلائے۔ پیار بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور پھر..........

وہ بے قابو ہو گئے۔ اور فاصلے نزدیکیوں میں بدلنے لگے اور پھر انہوں نے دیکھا کہ غزالہ تو ابھی بھی بھرپور جوان اور ایک دم گداز گداز ہے اور اس کی شخصیت میں زبردست نسوانی مقناطیسی کشش ہے۔ ایسا محسوس ہوا انہیں کہ جیسے وہ نہ جانے کب سے بہت پیاسے ہیں۔

اور جس وقت غزالہ ان کی گرفت میں تھی تو لطف اندوز ہونے میں دماغ ان کے دل کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنی ہی سوچ میں مصروف تھا۔ دل کو یہ سب اچھا لگ رہا تھا لیکن دماغ کو نہیں۔ یعنی دونوں الگ الگ راستوں پر چل پڑے تھے۔ دماغ فکرمند تھا۔ وہ فرح سے بے وفائی کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے ایسے موقع پر بھی فرح یاد آ رہی تھی۔ فرح اور فرح کی رفاقت۔ جیسے اندر ہی اندر وہ ان سے کہہ رہا ہو۔

"تم ایک خاندانی آدمی ہو اور اس غریب کو دھوکہ دے رہے ہو۔ اس کو، جس نے سولہ سال تک بہت وفاداری کے ساتھ اپنا سب کچھ تمہیں دے دیا۔ بدلے میں وہ ایک تمہاری وفاداری ہی تو چاہتی ہے اور وہ بھی تم نے آج کسی اور کے ساتھ بانٹ لی۔ اس کے ساتھ جو تمہاری کچھ بھی نہیں۔ وہ گزرے ہوئے کل میں نہ جانے کس کس کے ساتھ رہی تھی اور آگے بھی وہ نہ جانے کس کس کے ساتھ ہو گی۔ ایک آوارہ عورت۔ اور تم اتنے گر گئے کہ اب ایک آوارہ عورت کے ساتھ ہو لئے۔"

دماغ کی اس تنبیہ نے مزہ کرکرا کر دیا۔ لیکن پھر اس کے دل نے اس سے کہا۔

"تمہارا یہ دماغ تمہارے ضمیر کی آواز بن کر خواہ مخواہ کیوں بولنے لگا ہے۔ وہ بھی ایسے وقت کہ جب میں یکسانیت اور بے اطمینانی سے قرار حاصل کرنے آیا ہوں۔ اگر زندگی سے اور تمہاری جاتی ہوئی جوانی سے کچھ لطف حاصل کرنا چاہتا ہوں تو اس کا کیا جاتا ہے۔ اس کو بڑی فکر ہے نیک نامی کی۔ بہت زیادہ نیک نامی بھی ایک بے کاری چیز ہے۔ نیک بنے رہو اور گھر میں سڑتے رہو۔ کیوں۔؟ اور اپنے دل کو وقت سے پہلے بوڑھا کر لو۔ ارے

خواہ مخواہ میرا کیوں کباڑا کرتے ہوئے بھائی......"

دل و دماغ کی جنگ چلتی رہی اور وہ مصروف بھی رہے۔اس مقصد کے حصول میں کہ جس کے لئے وہ اپنی جادوگرنی کو لیکر آئے تھے۔جادوگرنی کے پاس بہت جادو تھے۔ وہ الجھ کر رہ گئے اور کچھ دیر کو تو دماغ کی نصیحت کو بھی بھول بیٹھے۔بس دل تھا اور وہ۔دونوں مستی میں تھے اور کچھ دیر کو دل ہی اس پر حاوی رہا جس نے بہت لطف دیا اسے۔

لیکن اس مدت کو بھی ختم ہونا تھا۔جادو بھری لطافتیں جیسے یکا یک ہوا کے ساتھ اڑ گئیں اور دماغ کو پھر سے گویائی حاصل ہوگئی۔دماغ اس کو خوابوں کی حسین دنیا سے حقیقت کی پتھریلی زمین پر لانے کو تلا ہوا تھا۔

"یہ عورت اپنا جادو دکھا کر تمہیں کہاں لے آئی۔لذت اور لطافتیں تو لائی لیکن بس تھوڑی دیر کو۔اور دیکھو، یہ اتنی اچھی کب لگ رہی ہے۔اب تو یہ تمہاری نظروں میں بھی گری گری لگ رہی ہے۔اس کے پیچھے بھاگتے رہو گے تو دیکھ لینا ایک دن منہ کے بل گرو گے۔کوئی خراب بات چھپی نہیں رہتی۔کوئی نہ کوئی اس راز کو ایک نہ ایک دن افشا کر ہی دے گا اور جو کچھ ابھی پوشیدہ ہے وہ پوشیدہ نہ رہے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" غزالہ اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی "یکا یک خاموش کیوں ہوگئے۔کیا یہ سب اچھا نہیں لگا؟" "کیوں نہیں لگا۔بہت اچھا لگا"۔وہ مسکرایا "اور خاموش اس لئے ہو گیا کہ باتوں کا اسٹاک ختم ہوگیا۔اب تم بولو اور میں سنوں گا۔لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہم چلیں۔کوئی ہمیں یہاں زیادہ دیر کیوں دیکھے۔باتیں راستے میں ہی کریں گے"

"وہ سندر تو آجائے"

"آتا رہے گا۔یہاں کوئی چوری کرنے نہیں آسکتا کیونکہ ہمارے فارم کا کتا بہت خطرناک ہے۔"

"لیکن کیا ہم بہت جلدی نہیں جا رہے ہیں۔؟"

"یہاں سے چل کر شہر میں کھانا کسی اچھے ہوٹل میں کھائیں گے اور اس کے بعد کوئی اچھی سی پکچر دیکھیں گے"

''یہ بھی ٹھیک ہے''

واپسی میں وہ گاڑی تیز چلا رہا تھا یہ سوچ کر کہ اگر وہ اپنے آپ کو مصروف رکھے گا تو ضمیر کی آواز بن کر دماغ اپنا لکچر پھر شروع نہ کر سکے گا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ شیطان کو یاد کرو اور وہ حاضر۔ شیطان کی سی ہی تیزی سے ضمیر کی آواز بن کر دماغ پھر اسکے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ بولا۔

''کچھ ہوش بھی ہے؟ بیوی کو اگر یہ سب تمہارے کرتوت پتہ لگ گئے تو وہاں اس کے دل ودماغ پر کیا ردِعمل ہوگا۔؟''

''کیا ہوگا۔؟'' اس نے دماغ سے پوچھا۔

''اس کا دل خالی ٹوٹے گا ہی نہیں، وہ پھر تمہاری اتنی وفادار نہیں رہے گی''۔

''دیکھو تم مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''ہاں ڈرا رہا ہوں، کیونکہ ڈر میں ہی انسان کی حفاظت پنہاں ہے۔''

''تو پھر بتاؤ کہ اگر بیوی یہ سب جان لے گی تو کیا کرے گی۔ وہ تو ہمیشہ ہی گھر میں رہتی ہے۔''

گھر میں تو رہتی ہے لیکن گھر میں رہتے رہتے بھی وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کر سکتی ہے''

''وہ کس طرح۔''

''وہ اس طرح...... کہ گھر میں اس کے پاس بھی خاندان کے کئی مرد آتے ہیں۔ اگر...... اگر اس نے...... تم سے بغاوت کر دی...... اور بغاوت کے خیال کے دماغ میں رہتے رہتے ہی وہ تم کو بھی باسی سمجھنے لگی تو......''

''تو کیا ہوگا......؟''

''کیوں پوچھتے ہو یہ سب کھلم کھلا''

''لیکن میں بھی تو سنوں کہ پھر کیا ہوگا؟''

''پھر وہ ہوگا...... جو تم نے ابھی ابھی کیا''

کیا بکتا ہے...... بھاگ یہاں سے...... اگر ایسا ہوا تو، یا تو وہ نہیں یا میں نہیں......''

''تب بھی بربادی تو تمہاری اور تمہارے گھر کی ہوئی نا۔ کیوں اپنے گھر کے دشمن بن گئے ہو؟''

''لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی''۔

''کیوں نہیں کر سکتی۔ وہ بھی ایک انسان ہی ہے اور اگر وہ تمہارے بدلے میں ایسا کرے گی تو اتنی گناہگار نہ ہوگی جتنے تم ہو''۔

''تو پھر......؟''

''اب فیصلہ تم کو ہی کرنا ہے...... میں تو چلا......''

وہ پریشان ہو گیا۔ سارا موڈ برباد ہو گیا تھا۔ اب آگے کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایک طرف یہ حسین جادوگرنی اور جادوگرنی کی حسین جنت اور دوسری طرف اس کی بیوی اور گھر۔ ایک کو تو کھونا ہوگا۔ ممنوعہ دلچسپیاں یا گھر کا سکون۔

پھر وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی شہر آ گیا تھا۔ غزالہ نے پوچھا ''یہ کہاں چل رہے ہو۔ کیا ہوٹل نہیں چلنا ہے۔ اور ہوٹل کے بعد پکچر......؟''

''کچھ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ دماغ بھاری بھاری سا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔ پروگرام ادھورا رہنے کا مجھے افسوس ہے۔ پکچر پھر کبھی سہی''

غزالہ حیرت زدہ تھی۔ لیکن منہ سے کچھ بول ہی نہ پائی۔ حامد میاں کے تیور اب کچھ دوسرے ہی تھے۔

☆☆

راکھ میں دبی چنگاری

ماضی کی دُھند میں نہ جانے کتنے رشتے سوکھے پتوں کی طرح اُڑ جاتے ہیں لیکن کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کے درمیان جھولتے رہتے ہیں۔اس طرح کے رشتے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی طرح برسوں سلگتے رہتے ہیں۔

یہ کہانی میرے بچپن سے شروع ہو کر میری جوانی کے دنوں سے گزرتی ہوئی میرے ادھیڑ پن تک آجاتی ہے۔اب اگر کوئی سمجھے تو اس کہانی کو میری محبت کی کہانی سمجھ سکتا ہے۔جس کا میں نے کبھی ہُما سے اقرار نہیں کیا۔

''جی ہاں۔اس کا نام ہُما ہے اور میرے علاوہ یہ کہانی ہُما کی بھی ہے جو دنیا والوں کی نظر میں تو پچاس سالہ بوڑھی عورت ہے لیکن جو پچاس برس کی ہو جانے کے باوجود میرے تصورات میں کبھی بوڑھی نہیں ہوئی۔آج بھی وہ مجھے ویسی ہی جوان اور پُر کشش نظر آتی ہے۔لیکن ہم دونوں دو مختلف راہوں کے مسافر ہو گئے تھے۔ایسے دو راستے جو جنگل میں سے گزرتے ہوئے کہیں نہ کہیں قریب تو آجاتے ہیں لیکن ذرا سا آگے چل کر پھر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔بچپن میں ہم دونوں ایک ہی قصبے میں رہتے تھے۔پہلی ملاقات اس سے اس وقت ہوئی جب وہ اٹھارہ برس کی تھی اور میں اکیس سال کا۔میں ذرا خاموش طبع اور سنجیدہ قسم کا تھا جب کہ اس کا چہرہ کھلے ہوئے گلاب کا سا تھا جس پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔اس کا قد دراز تھا اور وہ واقعی ایک خوبصورت اور پُر کشش لڑکی تھی۔پہلی ملاقات میں ہی اس نے مجھے اپنی جانب راغب کیا تھا۔دوسری ملاقات میں وہ مجھے بہت پُر کشش نظر آئی تھی اور پھر بعد کی ملاقاتوں میں تو مجھے اس میں بہت اپنائیت لگنے لگی تھی۔

ہُما اور میری ملاقاتوں کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ قصبہ شاہپور میں میری ہی عمر کا ظہیر نام کا ایک لڑکا مجھے ایک دن ہُما کے گھر لے گیا تھا۔ وہ رشتے میں ہُما کا چچا لگتا تھا اور ہُما کے والدین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس کے ذریعہ ہُما کے گھر میرا جانا آنا بڑھ گیا تھا۔ میرے ابو قصبے کی تحصیل میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے اور ہُما کے ابا میرے ابو کے ماتحت تھے۔ اس لیے ہُما کے ابا مجھے بہت عزت سے گھر میں بٹھایا کرتے تھے۔ اور اس کی امّی بھی بہت خلوص سے پیش آتی تھیں۔ ظہیر گھر پر نہ ہوتا تو اس کے انتظار کے بہانے میں وہاں ٹھہر جاتا۔ تب ہُما مجھ سے باتیں کرتی۔ قصبے کے گھروں میں ان دنوں چائے پینے یا پلانے کا رواج نہیں تھا لیکن اگر گھر میں کبھی پکوان بنتے یا کبھی کبھی منگوڑے تلے جاتے تو مجھے ضرور پیش کیے جاتے۔ ہُما جتنی دیر بھی میرے پاس بیٹھ کر منگوڑوں سے خاطر کرتی میں اس کے بدن کی بھینی خوشبو کے زیر اثر مدہوش سا رہتا۔ ہماری ڈھیروں باتیں بھی ہوتیں۔

''ابنِ صفی کے جاسوسی ناول آپ پڑھتے ہیں؟'' ایک دن اچانک اس نے پوچھا تھا۔

''بہت شوق سے پڑھتا ہوں'' میں نے جواب دیا تھا۔

''وہ مجھے بھی لا کر دے دیا کیجیے میں بھی شوق سے پڑھتی ہوں۔''

''ان میں کون سا کردار آپ کو زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کرنل فریدی کا یا حمید کا؟''

''مجھے تو سارے ہی کردار اچھے اور دلچسپ لگتے ہیں لیکن قاسم کا کردار بہت دلچسپ ہوتا ہے'' ایک دن اس نے بتایا۔

''ہم لوگ اگلے اتوار کو ابا کے ایک میواتی دوست ابراہیم خاں کے گاؤں شیو پورہ جا رہے ہیں۔ بھٹے کھانے۔ ظہیر چچا کے ساتھ آپ بھی چلیے گا۔'' اس نے آگے کہا۔

''لیکن مجھے ندی کی مچھلی زیادہ پسند ہے۔ وہ کھلوانے کا وعدہ کرو تو پھر سوچیں گے۔''

''وہاں گوشت ملے یا نہ ملے لیکن مچھلی تو ملتی ہی ہے۔ گاؤں کے نزدیک ہی بہت بڑی ندی ہے اور میواتی لوگ ہر سال بارش آنے سے پہلے ندی میں رو جا باندھتے ہیں جہاں مچھلی ہر رات خوب گرتی ہے۔ لہٰذا مچھلی کھلانے کا وعدہ''۔

''تو پھر میرا آپ کے ساتھ چلنے کا وعدہ۔''

اور یوں دو چار دن بعد اس کے گھر پر اس سے ملاقات ہوتی تو بہت اچھا لگتا تھا۔

پھر میں اس کے گھر جانے کے بہانے تلاش کرنے لگا۔

چار پانچ بار میں اس کے گھر والوں کے ساتھ شیوپورہ گاؤں گیا تھا۔ گاؤں میں اس کے ساتھ ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان یا ندی کے کنارے چلنا بہت اچھا لگتا تھا۔ خصوصاً گاؤں میں رات کے وقت کا وہ سماں تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا جب موسم سرما کی بیحد سرد راتوں میں ہم سب چولہے کی خوب تیز جلتی آگ کے سامنے بیٹھ جاتے۔ ابراہیم خاں کی بیوی مہر النسا کھانا پکاتی رہتی اور ابراہیم خاں خوشی خوشی لکڑیاں اور دیگر سامان لے لے کر آتے اور ہم لوگ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھ اور کپکپاتے بدن چولھے کی آگ سے سینکتے اور پھر کھانا تیار ہو جانے پر وہیں چٹائی پر بیٹھ جاتے۔ اور کبھی دیسی مرغ تو کبھی ندی کی مچھلی اور کبھی اصلی گھی میں ڈوبی ہوئی باٹیاں مسور یا مونگ کی دال کے ساتھ اور کبھی جوار کی روٹی اور اڑد کی کالی دال ہری مرچ کی چٹنی کے ساتھ کھاتے۔ گاؤں کے پانی میں جو بھی کھانا پکایا جاتا تھا وہ اتنا لذیذ ہوتا جو بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی میسر نہیں ہوتا۔

ایسے رومینٹک ماحول میں ہُما اور میرا تنہائیوں میں بہت ساتھ رہا۔ وہ فلموں کے درد بھرے نغمے بہت اچھی آواز میں گاتی تھی۔ بہت حسین دن تھے۔ ہم دونوں کھیتوں کے کنارے کہیں بھی بیٹھ جاتے اور زمانے بھر کی باتیں کرتے رہتے۔

آج بھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ تنہائیوں میں بھی میں نے کبھی اس پر غلط نظر نہیں ڈالی۔ یہاں تک کہ میرے دل میں کبھی کسی غلط خیال نے سر نہیں ابھارا۔ دراصل ہُما اور میرے رشتے کے درمیان میں مَیں نے کبھی احترام کی حدوں کو پار کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی اچھے خیالات کی پاکباز اور معیاری لڑکیوں کو اچھے گھرانوں کے اچھے لڑکے ہمیشہ اپنی آنکھوں کے پاکباز لینس سے ہی دیکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں بہت لڑکے بہت شرمیلے ہوا کرتے تھے۔ خود میں بھی شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اور پھر مجھے قصبے کی بےفکریوں کو چھوڑ کر کالج کی تعلیم کے لیے شہر جانا پڑا۔ نوجوانی کے دن بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کئی مشاغل اپنی جانب راغب کر لیتے ہیں۔ میں شہر کی دلچسپیوں میں کھو گیا اور وہاں نئے نئے بہت سے دوست بنتے گئے جن میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ اب یہ بات اور تھی کہ ہُما جیسی کشش شہر کی ان لڑکیوں میں نہیں تھی۔

میں چار ماہ کے عرصے میں شہر سے اپنے قصبے کو جاتا۔ ایک دو دن ٹھہر کر اور ہُما سے ملاقات کر کے واپس شہر آجاتا۔ اس طرح تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ پتہ ہی نہ چلا۔ ایک روز شام کے وقت گھر آیا تو قصبے سے آئے ایک مہمان کے ذریعے معلوم ہوا کہ ہُما کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ جان کر مجھے صدمہ ہوا۔ لیکن جلد ہی سنبھل بھی گیا اور یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ میں تو ابھی زیرِ تعلیم ہوں جب کہ قصبے اور دیہاتوں کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زیادہ عمر تک بٹھا کر نہیں رکھتے۔ ویسے بھی ہم دونوں میں عہد و پیمان نہیں ہوا تھا۔ عہد و پیمان ہوتا بھی کیسے، ہم نے تو آپس میں اس بات کا بھی اقرار نہیں کیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ نہ اس کا کوئی موقع آیا تھا اور نہ یہ کہنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ ٹھیک ہوگا کہ ان دنوں میں سمجھ ہی نہ سکا تھا کہ میرے دل و دماغ میں اس کے لیے جو جذبات تھے وہ محبت کے تھے یا دوستی کے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں کے جذبات میں اگر محبت نہ تھی تو پھر کیا تھا کہ اپنی شادی کے بعد بھی وہ بہت اپنے پن سے ملتی تھی اور میں بھی کسی نہ کسی موقع پر دیوانہ وار اس کے گھر جا کر اس سے ملتا تھا۔

اور پھر بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظروں میں شکایت تھی۔ جواب میں میری نظروں نے کبھی کچھ نہیں کہا البتہ ندامت ضرور محسوس کی —— ہُما کی شادی قصبے میں ہی ایک کاشت کار کے بیٹے اقبال سے ہوئی تھی جو مڈل پاس تھا۔ اور چوں کہ وہ میرا دور کا رشتے دار تھا اس لئے اس کے گھر میرا بچپن سے آنا جانا تھا۔ ہُما کی شادی کے بعد بھی میں ہُما سے ملتا رہا۔ اپنے شوہر کے مقابلے میں ہُما زیادہ دنیادار تھی اور ہر بات کی معلومات کچھ زیادہ ہی رکھتی تھی۔ اس لیے وہ اس کے سامنے خاموش رہتا تھا۔ شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ ہُما کا روّیہ اپنے شوہر سے کچھ اچھا نہ تھا۔

پھر سننے میں آیا کہ ہُما نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ اس کے بعد وہ اپنے شوہر سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اقبال ایک تو گھر میں رہتا ہی کم تھا لیکن جب بھی گھر میں ہوتا تو یا تو خاموش رہتا یا اپنی اماں سے باتیں کرتا رہتا۔ وہ یقیناً بیوی کی موجودگی میں احساسِ کمتری کا شکار نظر آتا تھا۔ اور یہی بات اس کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں پیدا

کررہی تھی۔اس کی زندگی کے اس المیے کا ذمے دار بلاواسطہ طور پر میں خود کو سمجھتا تھا۔اور تب ،ایسے وقت میں سوچنے لگتا کہ ہُما کی زندگی میں میرا آنا اس کے لیے کچھ اچھا نہ ہوا۔ اس نے مجھے آدرش سمجھ لیا تھا اور وہ اپنے شوہر کا موازنہ میرے معیار کو دیکھ کر کرتی تھی۔

پھر جب میں سرکاری ملازم ہوگیا تو میری بھی شادی ہوگئی اور پھر سال پر سال گزرنے لگے۔ان برسوں میں میرا شاہپور جانا بہت کم ہوگیا تھا کیونکہ میرے بھی گھر والے یعنی والدین اور بہن بھائی شہر آچکے تھے۔البتہ شہر کی کسی شادی میں ہُما مجھے کبھی کبھی مل جاتی تھی۔تب ہم لوگ ایک دوسرے کی خیریت پوچھ لیا کرتے تھے اور پرانے دن یاد کرلیا کرتے تھے۔اس وقت ہم لوگ بہت اپنائیت کے ساتھ ملتے تھے اور دس بیس منٹ یا آدھا گھنٹہ بہت دلچسپی کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔

کئی سال گزر جانے کے بعد بھی میں نے محسوس کیا کہ ہُما کی چاہت میرے دل میں راکھ میں دبی چنگاری کی طرح سوئی ہوئی تھی جو اس سے ملاقات کے وقت تھوڑی سی بھڑک اٹھتی تھی۔اور شاید یہی حال ہُما کا بھی تھا۔ایسا لگتا تھا کہ ہماری ملاقات کے وقت وہ یہ بھول جاتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے اور کسی کی بیوی ہے اور میں بھی بھول جاتا تھا کہ میری بھی ایک بیوی ہے۔وقت کی پرواہ کیے بغیر ہم لوگ باتوں میں کھو جاتے۔پرانے دنوں کی باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔اس طرح کبھی اچانک اس سے مل کر مجھے سچ مچ بہت خوشی ہوتی تھی۔لگتا کہ میرا اور ہُما کا آپس میں کوئی رشتہ ضرور ہے جو بلاشبہ دلوں کا ہے اور بہت گہرا ہے۔دو چاہنے والے اگر کسی وجہ سے ایک نہیں ہو پاتے تو پھر شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان کا رشتہ دل سے بہت گہرا ہو جاتا ہے۔اور جب کبھی بھی ان کا یکایک سامنا ہو جاتا ہے تو وہ بہت بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ایسے وقت کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اگر زندگی بھر کے لیے اس کا اور میرا ساتھ ہو جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔پھر میری زندگی میں کوئی کمی نہیں رہتی۔

مجھے یاد ہے،اس کی شادی کے ساتویں سال جب میں میٹھی عید کی شام کو اپنے قصبے گیا تھا تو رات میں ہی اس کے شوہر اقبال نے مجھ سے آکر کہا تھا کہ اگلے روز دوپہر کا کھانا ان کے یہاں کھاؤں۔

اگلے روز دوپہر کو میں اس کے گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اقبال وہاں نہیں تھا۔ گھر میں بس ہُما، اس کی دو بچیاں، ایک بیوہ خالہ زاد بہن، اور دس بارہ سال کے پڑوس کے دولڑکے تھے۔ پہلے مجھ سے بڑی بہن شاہدہ آکر ملی تھی۔ پھر ہُما مسکراتی ہوئی اور ہاتھ سے سلام کرتی ہوئی میرے سامنے آئی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا کوئی بہت اپنا یکایک سامنے آ گیا۔

''اب تو شاہپور آنے میں بہت دن لگا دیتے ہو؟'' اس نے کہا تھا۔

''زندگی کی الجھنوں نے بہت بری طرح جکڑ لیا ہے۔ پھر بھی کبھی نہ کبھی آہی جاتا ہوں۔''

''کہاں آجاتے ہو، عید کا چاند بن گئے ہو۔ عید کا چاند تو ہر سال نظر بھی آجاتا ہے لیکن جناب دو تین سال میں ہی نمودار ہوتے ہیں۔''

''تم بھی تو ہمارے یہاں نہیں آتیں۔''

''عورت مجبور ہوتی ہے لیکن مرد تو مجبور نہیں ہوتے۔''

اس کی بات صحیح تھی۔ وہ مجبور نہ ہوتی تو کسی دوسرے کے گھر نہ بیاہی جاتی اور وہ مجبور نہ ہوتی تو اپنی شادی کے بعد بھی دوڑ دوڑ کر میرے پاس آتی۔

میں نے بات بدلتے ہوئے اس سے پوچھا تھا ''اقبال بھائی نظر نہیں آرہے ہیں۔''

''وہ آپ کے لیے جامن لینے چوپڑا باغ گئے ہیں۔ شاہپور میں بس یہی ایک چیز تو اچھی ملتی ہے۔''

''یہ بات غلط ہے۔ شاہپور میں دو چیزیں اچھی ملتی ہیں۔''

''دوسری چیز کیا ہے؟''

''جامن منگوانے والی۔''

''بات بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔''

پھر کھانا میرے سامنے آیا۔ کھانے کے اقسام اور ان کا ذائقہ بتا دیتے ہیں کہ میزبان کے دل میں مہمان کے لیے کتنی قدر ہے۔ لہٰذا اس دن کے کھانوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہُما کے لیے میں اب بھی اہمیت رکھتا تھا۔ دیسی مرغ، بریانی، کباب اور کھیر اور پھر لذیذ

بھی۔ کھانوں کی لذت یقیناً میزبان کی محبت سے دوبالا ہو جاتی ہے۔ میں ایک پلیٹ ختم نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنی مخروطی انگلیوں سے دوسری ڈش میرے سامنے رکھ دیتی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا تھا۔

"کیا اب گاؤں یاد نہیں آتا؟"

"مجھے گاؤں سے زیادہ تمھارے ابا کے دوست ابراہیم خاں یاد آتے ہیں۔ وہ لوگ سب خیریت سے تو ہیں نا؟"

"اس دنیا میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ حاجی ابراہیم چچا کی بیوی مہرالنسا بیگم کی دونوں آنکھیں چلی گئی ہیں۔ ان کے بڑے والے لڑکے ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ بس دو چھوٹے لڑکے صدرالدین اور آزاد ہی ماں باپ کا خیال رکھتے ہیں اور نزدیک کے گاؤں کھیر کھیڑی سے بیٹی داماد تاج بی اور نصیب اکثر آکر ان کے کاموں میں ہاتھ بٹالیا کرتے ہیں۔"

برسوں پہلے شاہپور کی وہ دوپہر اور بہت پیار سے مجھے کھانا کھلاتے وقت ہُما کا مسکراتا ہوا چہرہ آج بھی مجھے یاد آتے ہیں۔ لیکن پھر بعد میں ماہ وسال کے اثرات ہُما کے چہرے اور اس کی پرکشش شخصیت میں تبدیلیاں لاتے گئے۔ چاند سا چہرہ مرجھا گیا اور سر کے بال کھچڑی جیسے ہو گئے — لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میرے دل میں اس کے حسن کا چاند نہیں گہنایا۔

پھر وقت کچھ اور تیزی سے پنکھ لگائے اڑنے لگا۔ میرا شاہپور جانا بہت کم ہو گیا۔ بہت عرصے بعد ہُما ایک روز اقبال کے ساتھ میرے گھر آئی۔ اس نے بتایا کہ اقبال کے پیٹ میں السر ہو گیا ہے۔ جس کا علاج اب شہر میں کرایا جانا ضروری ہے۔ وہ اپنے ایک عزیز کے یہاں ٹھہری تھی اور میں چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے یہاں نہ ٹھہرا سکتا تھا کیونکہ میری بیوی جانتی تھی کہ میں ہُما کے لیے برسوں سے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا ہوں۔ اس کو اپنے گھر میں رکھ کر بیوی سے خود کو رسوا کرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے ہی اقبال کے علاج میں کچھ بھاگ دوڑ کر کے اس کی مدد کی۔ اس کے انکار کے باوجود کچھ مالی مدد بھی کی۔ لیکن تب ایک ہفتے بعد ہی وہ لوگ واپس اپنے قصبے لوٹ گئے تھے۔

اور پھر قریب دو سال بعد ایک عزیز نے مجھے اطلاع دی کہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ مجھے صدمہ ہوا۔ اقبال جیسا بھی تھا ہُما کا شوہر تھا۔ ہُما عدت میں تھی لہٰذا یہ اطلاع ملنے کے

بعد فوراً نہیں گیا بلکہ اس کی عدت پوری ہونے پر ہی میں کار لے کر شامپور کے لیے چل پڑا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ سے مل کر ہما کی اداسیاں بہت دوتک کم ہو جائیں گی۔

ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد میں شامپور پہنچا اور سیدھا ہُما کے گھر گیا۔ وہ دروازے پر نہیں آئی۔ اس کی بڑی بیٹی روبی آئی تھی۔ پھر میں ہُما کے کمرے میں گیا۔ پڑوس کی تین عورتیں اس کے ساتھ نیچے گدے پر بیٹھی تھیں جو میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہُما بھی کھڑی ہوگئی اور ہمیشہ کی طرح اس نے مجھے سلام کیا۔ مگر اس بار بغیر اپنے ہاتھ کو جنبش دیتے ہوئے۔ وہ بہت غمگین لگ رہی تھی اور چہرے سے زندگی کی رعنائی کے سارے آثار رخصت ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے پاس میں رکھے لکڑی کے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے دوسرے صوفے پر وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''کیسے ہوا یہ سب'' میں نے پوچھا۔

''وہ دوا ٹھیک سے نہیں لیتے تھے جس سے مرض پلٹا گیا۔ پھر ایک رات اچانک پیٹ میں تیز درد اٹھا تو یہاں کے ڈاکٹر نے بتایا کہ اندر پیٹ میں چھالا پھوٹ گیا ہے، آپریشن کے لئے شہر لے جانا ہوگا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور کڑاکے کی سردی تھی اور ان کو شہر لے جانے کے لئے قصبے میں ایک بھی گاڑی نہیں تھی۔ نہ بس، نہ ٹرک، نہ جیپ اور نہ کار، ہم صبح تک انتظار کرنے کو مجبور تھے۔ صبح ہوئی۔ سورج نمودار بھی ہوا اور تب کہیں سے ایک بس ان کو شہر لے جانے کے لیے ہمارے گھر لائی گئی، مگر اس دن کا سورج وہ نہ دیکھ سکے اور چل بسے......''

اتنا کہہ کر وہ رو پڑی۔ وہ سچ مچ بہت رنجیدہ تھی۔ میں نے بھی سر جھکا لیا تھا۔ کچھ وقت خاموشی میں گذرا۔ دیر تک وہ سسکتی رہی۔ پھر اس نے میرے لیے چائے منگوائی۔

چائے پیتے پیتے میں نے پوچھا ''پیپٹک السر کوئی مہلک مرض تو نہیں۔ پھر یہ کیسے ہوگیا۔''

''انھوں نے تیز مرچ کھانا نہیں چھوڑا تھا اور دوا کے معاملے میں بھی بہت لاپرواہ ہو گئے تھے اور......''

''اور یہ کہ وہ جینا نہیں چاہتے تھے'' یہ بات ہُما کی بڑی بیٹی روبی نے کہی جسے سن

کر میں چونک گیا اور ہُما بھی۔ میں نے چند لمحے روبی کی جانب گھور کر دیکھا۔ پھر چائے کی پیالی نیچے رکھ کر اس سے پوچھا۔

''کیوں جینا نہیں چاہتے تھے؟''

''کیوں کہ ممی نے ان کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا اور ہمیشہ ان کو اپنے سے کمتر سمجھا اور یہی نہیں، موقع ملتے ہی ان کی ہنسی بھی اڑائی۔ یہ دوسرے لوگوں کو عزت دیتی تھیں مگر اپنے شوہر کو نہیں۔ اس بات کا رنج ابا کو بہت تھا۔ وہ زندگی سے بیزار بیزار سے رہتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوئی بھی کوشش نہیں کی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ پرہیز کی طرف سے بھی لاپرواہ تھے۔''

میں اور ہُما سناٹے میں آ گئے۔ اتنی چھوٹی لڑکی اور اتنی بڑی بڑی باتیں۔ مجھے لگا کہ اس کا الزام غلط نہیں تھا۔ اس کی شکایت میں کچھ نہ کچھ تو سچ تھا ہی۔ لیکن معمولی نظر آنے والی اس شکایت میں ایک بہت بڑا الزام تھا۔ اس الزام کے صدمے سے چند لمحوں بعد ہُما ابھری تو اس نے بیٹی سے کہا۔

''یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں نے اتنے سال ان کے ساتھ ویسے ہی نہیں گزار دیے۔ اگر ان کو کچھ نہ سمجھتی تو ان کو کب کا چھوڑ چکی ہوتی۔

''آپ سچ نہیں بول رہی ہیں''بیٹی نے بغیر کسی جھجک کے کہا''ایمان سے بتایئے کہ جو عزت آپ نے ناصر انکل کو دی، کیا وہ آپ نے میرے پاپا کو دی؟''

اس نے ہمارے رشتے کا ایکسرے کر کے ہم دونوں کو خاندان کی بربادی کا ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ میں نے سوچا اس موڑ پر اب مجھے ہُما کے معاملے میں کوئی فیصلہ لینا ہی ہوگا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہُما تو جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سخت صدمے سے دوچار تھی۔ صدمہ مجھے بھی تھا لیکن میں نے اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''اچھا اب چلتے ہیں۔ پھر کبھی ملیں گے۔''

''انکل! آپ میری باتوں سے ناراض ہو گئے ہیں؟'' روبی نے کہا۔

''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں۔''

''آپ ضرور ناراض ہیں۔ کیونکہ اگر ناراض نہ ہوتے تو اتنی جلدی جانے کے

لیے نہ کہتے۔''

''وہ تو......''

''اب آپ غصہ تھوک بھی دیجیے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ ہمیں آپ بہت عزیز ہیں اور ہمیں اب آپ کی ضرورت بھی ہے۔ ہمارے کوئی ماموں نہیں ہیں۔ اب آپ ہی ہمارے ماموں ہیں...... ماموں جان...... پیارے ماموں جان۔ اور دیکھیے، یہ رشتہ اب کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اس رشتے سے اب ہم سبھی بندھ گئے ہیں۔ بولیے، یہاں آنا تو نہیں چھوڑیں گے؟''

میں نے کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھا پھر دھیرے سے کہا ''نہیں چھوڑوں گا۔''

''ایسے نہیں مسکرا کر کہیے''

میں مسکرا دیا۔ کچھ ایسے کہ جیسے موسم سرما کے کڑکرتے جاڑوں میں بادل چھٹنے کے بعد یکا یک سورج کی نرم گرم کرنیں نمودار ہو جاتی ہیں ہلکی سی مسکراہٹ ہُما کے چہرے پر بھی پھیل گئی۔

اور تب میں روبی کے سر پر ہلکی سے چپت مار کر اطمینان کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اطمینان اس بات کا کہ ہُما اور میرے رشتے کو اب ایک نام مل گیا تھا۔ ایک اچھا پاکیزہ نام۔

کجری

کجری جوالا پرشاد کی بہو تھی اور اسے گاؤں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ دراز قد، متناسب بدن اور موہنی صورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوش مزاج بھی تھی۔ تین سال قبل وہ ایک دوسرے گاؤں سے جوالا پرشاد کے گھر اس کی بہو بن کر آئی تھی تو اس نے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا تھا۔ اور صرف گھر کا کام ہی نہیں، اس نے تو کھیتی کے کاموں کی دیکھ بھال بھی شروع کر دی تھی۔

اور یہ جوالا پرشاد کے لیے اچھا ہی ہوا کیونکہ اس کا اکلوتا بیٹا بنسی لال ایک دم غیر ذمہ دار، کام چور اور ناپختہ سی ذہنیت کا تھا جو گاؤں کے کھیڑے باڑوں میں دو چار آوارہ لڑکوں کے ساتھ ادھر ادھر ڈولتا پھرتا تھا۔ یا پھر وقت بے وقت دیر دیر تک گاؤں میں ہر کہیں بیٹھا ہوا گاؤں والوں سے بے سر پیر کی باتیں اور ہنسی مذاق کرتا رہتا اور جب باہر سے دل بھر جاتا تب ہی گھر لوٹتا۔ باپ تو اسے کام سے لاپرواہی برتنے اور آوارہ پھرتے رہنے پر کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا مگر کجری اس سے کبھی کچھ نہ کہتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس سے کچھ کہنا سننا بے کار ہی تھا۔ وہ نکما کسی کام کا تھا ہی کب۔ گاؤں کی عورتیں ندی پر کپڑے دھوتے اور نہاتے وقت کجری کو اپنی دیہاتی زبان میں بتایا کرتی تھیں کہ بنسی تو بچپنے سے ایسا ہی اول جلول تھا اور بیاہ ہو جانے کے بعد بھی اس کے رنگ ڈھنگ کچھ خاص بدلے نہیں۔

اور یہ گاؤں کے چرواہے بھی اب ایسے بدمعاش ہو گئے تھے کہ جان بوجھ کر دوسروں کے کھیتوں میں اپنے جانور چھوڑ دیتے اور ساتھ ہی اتنے لاپرواہ بھی تھے کہ جب کبھی وہ دو چار مل کر کسی جگہ بیٹھ جاتے اور باتوں میں لگ جاتے تو ان کے جانور خود ہی کسی بھی کھیت کی فصل کو

چر لیتے۔ اس لیے جوالا پرشاد عموماً خود ہی علی الصبح کھیتوں پر جایا کرتا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ کسی دیگر کام میں مصروف ہوتا اور بنسی کو کھیت یا کھلیان میں جا کر نگرانی کرنے کے لئے کہتا تب بھی بنسی یا تو بستر سے اٹھتا ہی نہیں، یا اگر کبھی کسی طرح اٹھ کر بے دلی سے کھیتوں کی طرف چلا بھی جاتا تو جلد ہی واپس لوٹ آتا۔ اسے کھیتی اور کھیتی کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فرصت کے وقت وہ گاؤں میں بیٹھا ہوا کبھی کبھی گاؤں والوں سے کہہ دیتا تھا کہ اس کے بَتَل (عوض) کا کام اس کی عورت تو کر لیتی ہے، پھر وہ فکر کیوں کرے۔

لیکن ہاں، وہ اتنا ضرور کرتا کہ پاس کے قصبوں میں جس دن ہاٹ لگتی تو بیل گاڑی یا چھکڑی جوت کر اور اس میں کچھ غلہ رکھ کر ان قصبوں کو خوشی خوشی چلا جاتا اور وہاں غلہ بیچ کر گھر کے لیے سودا سلف اور بھینسوں کے لیے کھلی چنی خرید لاتا اور ساتھ ہی وہاں کی چکی سے گھر کے لیے آٹا پسا لاتا۔ اس کے کام سے ہی باپ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ چلو ہاٹ بازار کا کام تو وہ کر ہی لیتا ہے اور بہت ذمہ داری سے کرتا ہے۔

وہ جیسا بھی تھا، کجری اسے پسند کرتی تھی۔ ایک تو بہت بھولا بھالا تھا، دوسرے وہ کبھی اس پر یا گاؤں میں کسی پر بھی غصہ نہیں کرتا تھا۔ اور اسے چاہتا بھی تھا۔ جب کبھی کھانا بناتے وقت وہ گھر میں آ جاتا تو وہ اسے چولہے کے سامنے ہی چٹائی پر بٹھاتی اور اس کے سامنے پیتل کی تھالی میں کھانا پروس دیتی۔ اور پھر انگاروں پر پھلائی گئی گرم گرم روٹیاں اصلی گھی سے چپڑ چپڑ کر ایک ایک کر کے اسے دیتی جاتی اور تھوڑی دیر میں روٹی پکاتے پکاتے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتی بھی جاتی۔ ہنس مکھ اور گلابی گلابی سے تمتمائے ہوئے چہرے والا بنسی اسے اپنے پاس بیٹھا ہوا اور مزے لے لے کر کھانا کھاتا ہوا بہت اچھا لگتا تھا۔ اگر ایسے وقت گھر میں جوالا پرشاد موجود نہ ہوتا تو کھانا کھانے کے دوران ہی وہ کجری سے بغیر کسی جھجھک کے اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتا۔

''اب کے ہولی پہ چوگان میں بنولی کا ناچ ہُئی ہے۔ اُو میں ہم لوگن کے ساتھ تو بھی جرور ناچنے گانے آجیئو۔''

''موئے سرم آئے ہے۔''

''گاؤں کی سب بیرَ ہن (عورتیں) ہولی پہ ناچے ہیں، تو ہے کائے سرم آئے ہے۔''

وہ مسکرا پڑتی۔ بنولی کا ناچ مائیکے میں اسے بھی اچھا لگتا تھا۔ جب گاؤں کے دس بارہ ناچنے والے مرد وزن گول دائرے میں مٹک مٹک کر آگے بڑھتے اور ایک دوسرے کے ڈنڈے پر ڈنڈا مارتے تو کھٹا کھٹ کی آوازیں آتیں اور سچ مچ اس وقت بڑا ہی مزا آتا۔

وہ اپنے سسر کو بھی بہت چاؤ سے کھانا کھلاتی تھی۔ صبح کلیوے (ناشتہ) میں مہی سے بنی رابڑی، دن کے کھانے میں اصلی گھی سے چپڑی روٹی اور دال۔ اور شام کے کھانے میں مہی میں بنائی گئی کوئی سبزی اور سادہ روٹیاں۔ وہ کھانا اچھا کھاتے تھے اسی لیے ان کی صحت اچھی تھی۔ اچھی خوراک سے ساٹھ باسٹھ کی عمر میں بھی انکا بدن گٹھا ہوا تھا۔ گوشت، مچھلی اور شراب کبھی منہ پر نہیں رکھتے تھے مگر بیٹا ویسوالی ذات کا ہوتے ہوئے بھی ہریجن لڑکوں کی صحبت میں یہ چیزیں کھانے لگا تھا اور شراب تو اس کی دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی۔ قصبوں کے ہاٹ بازار کے دنوں کے علاوہ بھی کبھی کبھی کسی اور کی بیل گاڑی یا ٹریکٹر پر بیٹھ کر قریب کے ایک بڑی آبادی والے گاؤں چرنال چلا جاتا جہاں دیسی شراب کا ٹھیکہ تھا۔ وہاں سے دن ڈھلتے ڈھلتے اور کبھی کبھی تو بہت اندھیرا ہو جانے پر نشے میں دھت گھر لوٹتا اور تب بنا کسی سے کوئی بات کیے سیدھا اپنے کمرے میں جاتا اور بستر پر گر کر کجری کے آنے کا انتظار کرنے لگتا۔ باپ سے ڈرتا تھا، کیونکہ باپ نے جب بھی اسے نشے کی حالت میں دیکھا تو چلّایا۔ نشہ کرنے پر یا کام نہ کرنے پر باپ اسے بری طرح ڈانٹتا تو یہ بھی کجری کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ اسی لیے گھر میں مویشی کی دیکھ بھال سے لے کر فصل کے غلے کو مٹی کی بڑی بڑی کوٹھیوں میں بھروانے اور نوکرانی سے جانوروں کے گوبر وغیرہ کی صفائی کرانے تک کی ذمے داری اس نے خود اپنے اوپر لے لی تھی۔

بنسی سے اس کے بیاہ کو تین سال ہو چکے تھے مگر ابھی تک کالی مٹکی سے ماکھن چرانے والا کوئی نٹ کھٹ نہیں آیا تھا۔ جب کبھی وہ پڑوس میں ننھے منے بچوں کو کبھی اپنی ماؤں کی گود میں اور کبھی ادھر سے ادھر ٹھمک ٹھمک دوڑتے بھاگتے دیکھتی تو اس کا بھی من ہوتا کہ اس کے آنگن میں بھی اس کا منا کھیلے کودے۔ اور جب وہ ارئی سے مٹکی میں مہی کر رہی ہو تو اس کا نٹ کھٹ بالک اس کی مٹکی پکڑ کر اسے بار بار پریشان کرے۔ لیکن یہ خوشی تو اسے بھگوان کی اِچھا (مرضی) سے ہی مل سکتی ہے اور بھگوان کی اِچھا اس معاملے میں نہ جانے کیا

ہے۔وہ اس خیال کو پھر جلدی ہی ذہن سے جھٹک دیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی اور سوچنے لگتی کہ بس اس کا پتی ہمیشہ اس کے سامنے رہے اور عزت کے ساتھ اسی طرح زندگی کٹتی رہے تو یہی بہت ہے۔ بھلے ہی بنسی نا سمجھ ہے اور تھوڑا سا بگڑیل بھی ہے مگر اس کا اپنا تو ہے۔وہ جب گھر میں ہوتا ہے تو سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے۔

مگر کچھ دنوں سے بنسی سارے سارے دن غائب رہنے لگا تھا۔اس لیے وہ شام ہوتے ہی اس کا انتظار کرنے لگتی۔صبح اس سے پیسے لے کر جاتا تو پھر رات ہی میں کسی وقت لوٹتا۔وہ بھی نشے میں دُھت۔ایک لڑکے سے اطلاع ملی تھی کہ جو پیسے وہ گھر سے لے جاتا ہے ان سے خود بھی شراب پیتا ہے اور گاؤں کے بگڑے ہوئے لڑکوں کو بھی پلاتا ہے۔پھر ان کے گھروں میں ہی ماس مچھی کھاتا ہے۔وہ ایسا کیا کرے کہ بنسی گھر ہی میں اس کے پاس رہے اور ادھر ادھر بھٹکتا نہ پھرے۔کیا وہ دارو منگوا کر گھر میں رکھ لے اور اس کے ماس مچھی کا بھی گھر میں ہی انتظام کر دے۔نہ بابا نہ......وہ تو گھن کرتی ہے ان چیزوں سے۔وہ باہر ہی کہیں کھا پی لے تو ٹھیک ہے۔

لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ ان سب پریشانیوں سے بنسی اسے جلد ہی نجات دلا دے گا۔اس دن تو اسے بنسی کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔شام ہونے سے پہلے پہلے ہی اطلاع آ گئی کہ بنسی ندی کے گہرے پانی میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا......اور......مر گیا۔

گاؤں والے اس کی پانی میں بھیگی ہوئی لاش کو کھٹیا پر ڈال کر لے آئے تھے اور کھٹیا کو گھر کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔گاؤں بھر کے آدمی، عورتیں اور بچے اس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے تھے اور اس کی بے وقت کی موت پر بہت رنجیدہ تھے۔

کجری کی تو دنیا ہی لٹ گئی تھی۔سب کچھ پتی کے دم سے ہی تو ہوتا ہے۔بنسی کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور اس کے سنگ گزارے ہوئے دن بار بار یاد آنے لگے تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگی اور بین کرنے لگی۔

''موئے اکیلی چھوڑ کے چلو گیو رے......ارے موئے بھی او کے سنگ بار دیو (جلادو) رے......''

اور پھر کب پولیس آئی، کب لاش کا پنچ نامہ بنا، کب صبح ہوئی اور کب اسے گاؤں

کے باہر لے جا کر شمشان میں جلا دیا گیا، ان سب کا اسے کوئی ہوش ہی نہ تھا۔ وہ تو بس ایک طرف دالان میں پڑی روتی رہی۔ آنسو آئے تب بھی اور سوکھ گئے تب بھی۔ کبھی چہرے پر گھونگھٹ رہا اور کبھی نہیں بھی رہا۔ جب خود کی دنیا اجڑ جائے تو باہر والوں کا لحاظ اور رسم و رواج کی پرواہ کون کرے۔

بنسی کو گئے دن گزرنے لگے لیکن اس کی یادیں کجری کے ذہن سے جاتی ہی نہ تھیں۔ برتن مانجھتی تو مانجھتی ہی رہتی اور گھر میں جھاڑو دیتی تو دیر تک دیتی ہی رہتی۔ اسے برتن اور جھاڑو نظر نہیں آتے تھے۔ اس کے سامنے تو بس بنسی ہی رہتا تھا۔ اس کا گھر میں آنا جانا، اس کا ہنسی مذاق کرنا، کسی اندھیرے کونے میں اس سے لپٹ جانا، دارو کے لیے پیسے مانگنا اور پیسے ملتے ہی بچوں کی طرح خوش ہو کر پھر گھر سے باہر بھاگ جانا۔ بنسی کا بچپنا گیا ہی نہ تھا۔ یہ بچپنا ہی تو تھا کہ وہ نشے کی حالت میں اکیلا ہی ندی کے گہرے پانی کی ڈال کی طرف تیرتا ہوا چلا گیا تھا، جب کہ اس کے سارے ساتھی کم پانی میں ہی تیرتے رہے اور بنسی کے اصرار کے باوجود گہرے پانی کی جانب نہیں گئے۔ اب سب کو معلوم تھا کہ گاؤں کی یہ ندی دو چار برسوں میں ایک بار کسی انسان کی بھینٹ ضرور لیتی ہے اور گاؤں کا کوئی نہ کوئی انسان ندی کی اس گہری ڈال میں ڈوب جاتا ہے۔ گاؤں کی عورتیں کہتی ہیں کہ وہاں گہرے پانی کی ڈال میں کوئی شئے ہے جو نہانے والے کو اندر تک کھینچ کر لے جاتی ہے اور پھر جب تک کہ وہ مر نہیں جاتا، اسے اوپر نہیں آنے دیتی۔ بنسی بھی ڈوب جانے کے بہت دیر بعد پانی کے اوپر آیا تھا۔ کیسا مورکھ تھا وہ کہ جانتے بوجھتے بھی گہرے پانی میں چلا گیا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ لیکن یہ سب نشے کے کارن ہی تو ہوا۔ نشے میں نہ ہوتا تو اسے بھلے برے کا ہوش ضرور رہتا۔ نشہ تو اس شئے سے بھی خراب چیز ہے جو کسی مگرمچھ کی طرح گہرے پانی میں کہیں پر پڑی رہتی ہے۔ اور موقع ملتے ہی کسی انسان کو پانی کے اندر ہی دبوچ لیتی ہے۔

چند دنوں بعد ہی دیپاولی کا تیوہار آیا تو سارا گاؤں دیا بتی اور پھلجھڑیوں کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا اور پٹاخوں و گیج کنڈیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ مگر اس کا گھر تاریکیوں اور خاموشیوں میں ڈوبا اور غم کی کہانی کہتا نظر آیا۔ لیکن گھر سے زیادہ اس کے دل و دماغ کے اندھیرے گہرے تھے۔ ایسے میں اسے بنسی کی یاد بہت آئی۔ کیونکہ پچھلی دیوالی پر وہ خود تو

پھلجڑیاں کم جلاتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں دے دے کر زیادہ تر اس سے ہی جلواتا تھا اور پھر بچوں کی طرح خوش ہوتا تھا۔ کاہے چلا گیا وہ۔ آج سارا گاؤں خوش ہے لیکن اس کا من اور اس کا سنسار اجڑ کے رہ گیا ہے۔ اگر وہ نشہ نہ کرتا اور نشے کی حالت میں گہرے پانی میں جانے کی بے وقوفی نہ کرتا تو اپنی جان سے نہ جاتا اور اپنی پتنی کو ہمیشہ کے لیے اکیلی اور دکھی نہ کر جاتا۔

اس کی عمر کی گاؤں کی کچھ عورتیں اسے گاؤں میں لے جانے کے لئے آئی تھیں مگر وہ نہیں گئی، کیونکہ خوشیاں اچھے دل سے منائی جاتی ہیں اور دل تھا کہ کسی گہری دلدل میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔

خود تو بنسی اپنی جان سے گیا مگر اسے اکیلی چھوڑ گیا۔ وہ گھر کے کاموں سے نمٹ کر کھٹیا پر پڑے پڑے اور آنسو بہاتے بہاتے سوچا کرتی۔ اب یہ پہاڑ جیسا جیون اکیلے کیسے کٹے گا۔ بنسی کے سدا کے لیے چلے جانے کے بعد جیون پہاڑ جیسا ہی ہو گیا تھا۔ کسی کام میں بھی دل نہیں لگتا۔ سب کچھ برا لگتا ہے۔ بڈھا سسر بھی اداس اداس سا ادھر سے ادھر ڈولتا پھرتا اور اکیلا ہی گھر کے بڑے کام کرتا رہتا۔ قصبے کے ہاٹ بازار کے دن بنسی کی جگہ اب خود جوالا پرشاد ہی ایک پوٹلی میں غلہ باندھ کر بیل گاڑی سے قصبے کو جاتا اور گھر کے لیے سودا سلف لے آتا۔ بھینسوں کا دودھ گھر کا ہالی گبرو لگاتا تھا اور گبرو ہی کھیتی کے کام بھی کرتا تھا اور کھانا تو وہ کھائی کھیڑے والی گاؤں میں سے آ کر دونوں ٹائم بنا دیا کرتی تھی اور اس کے سامنے تھالی رکھ دیتی تھی۔ من ہوتا تو ایک دو روٹی کھا لیتی نہیں تو دو چار نوالے کھا کر تھالی آگے سرکا دیتی۔ بھوک تو اب لگتی ہی نہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہنسی خوشی کے دن بہت پیچھے رہ گئے۔

لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ گزرے دنوں پر جلد ہی وقت کی دھند چھانے لگتی ہے اور دنیا سے گزر جانے والوں کی یادیں بھی بالآخر دھندلانے لگتی ہیں اور روٹھی ہوئی زندگی ایک بار پھر سامنے آ کر اپنی جانب کھینچنے لگتی ہے۔ جو لوگ دکھ کے وقت سمجھاتے بجھاتے ہیں اور بہت زبانی ہمدردی کرتے ہیں پھر وہ بھی جلد ہی ہمدردی کرنا بھول جاتے ہیں اور اپنے اپنے کاموں میں کچھ ایسے مصروف ہو جاتے ہیں کہ دکھیاروں کی پھر خبر ہی نہیں لیتے۔

قریب ایک ماہ بعد کجری کو ہوش آیا کہ گھر کو اس کی توجہ کی ضرورت ہے اور ایک اکیلا سسر گھر کے کام کر کر کے تھک جاتا ہے، جب کہ وہ خود بھی تو جوان بیٹے کی موت سے

اندر اندر بہت دکھی تھا۔ کجری نے مہی کی مٹکی میں ارئی چلانا شروع کر دیا۔ پھر چولہے کے پاس بھی بیٹھ گئی اور روٹی بھی پیٹ بھر کھانے لگی۔ حالانکہ یہ سب کرتے کرتے بنسی اب بھی کبھی کبھی یاد آ جایا کرتا تھا۔ لیکن جلد ہی پھر اسے دھیان آنے لگتا کہ گواڑے میں صبح دیر تک گوبر پڑا رہتا ہے، صفائی والی وقت پر نہیں آتی۔ گائے بیل دالان میں گھس کر نیچے پڑا ہوا سویابین کھانے لگتے ہیں۔ پانی کے مٹکے اور گاگر خالی پڑے رہتے ہیں کیونکہ گبروہالی کھیتوں سے آکر وقت پر ان میں کنویں سے لاکر پانی نہیں بھرتا۔ ان مسائل پر اس کا دھیان جانے لگا۔ گھر کے کاموں کی طرف اگر وہ توجہ نہ دے گی تو پھر کون دے گا۔ سسر تو کھیتوں میں، کھلیان میں مزدوروں سے کام کراتا رہتا ہے۔ اسے کھیت پر ٹائم سے روٹی بھی تو ملنی چاہئے۔

غرض زندگی پھر معمول پر آنے لگی۔ اور گھر کے اور کھیتی باڑی کے ڈھیر سارے کام کاج میں وہ مصروف ہوتی گئی۔ کاموں میں مصروف رہنے کے دوران تو اسے کوئی غم آکر نہیں ستاتا تھا لیکن جب رات کو تھک کر بستر پر جا پڑتی تو تنہائی پھر جانے کدھر سے ستانے آجاتی۔ بستر کا زیادہ حصہ خالی نظر آتا۔ اور ایسے میں بنسی یاد آجاتا۔ کتنا اودھم مچاتا تھا وہ بستر میں۔ اور کبھی کبھی تو پیٹ میں گدگدی بھی کرنے لگتا تھا بالکل بچوں کی طرح۔ اس کے بارے میں سوچتے سوچتے اور اس کو یاد کرتے کرتے دیر سویر سے نیند آہی جاتی۔ لیکن کبھی کبھی رات کے کسی پہر نیند ٹوٹ جاتی تو وہ چونک پڑتی اور اس وقت تنہائی اسے بہت ستانے لگتی اور پھر دل پہ چوٹ لگانے والا یہ خیال بھی ستانے لگتا کہ اب تو اسے ہمیشہ ہی تنہا سونا ہے۔ اس جیسی بدنصیب عورت اس گاؤں میں تو کیا دور دور کے گاؤں میں بھی نہیں ہے۔

صبح اس کی نیند جلد ہی کھل جاتی۔ پہلے رفع حاجت کے لیے ندی کی جانب جاتی، پھر جلدی جلدی واپس آکر یا تو مہی کرتی یا پھر چکی میں دلیا یا بیسن پیسنے لگتی۔ اس طرح سارے دن مصروف رہ کر وہ تنہائی کے کرب کے احساس سے بچنا چاہتی تھی۔

یوں تنہا رہتے رہتے سال سوا سال کا عرصہ کب گزر گیا اس کا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ اس دوران اس کے بھائی نے اپنے گاؤں سے آکر اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ لے جانے کو کہا تھا تو اس نے مائیکے جانے پر غور بھی کیا تھا۔ مگر تبھی اس نے محسوس کیا کہ وہ تو سسرال کے گاؤں سے اور سسرال کے گھر کے بندھنوں میں کب کی بندھ چکی ہے جو یہ بندھن پتی کے

مرنے سے بھی نہیں ٹوٹ سکتے۔اور تب اس نے بھائی سے کہہ دیا تھا کہ اب یہی اس کا گھر ہے اور بنسی کی جائداد میں اس کا حصہ بھی ہے اور اس لیے باپ جیسے سسر کو اور اپنے سورگ واسی پتی کے گھر کو چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جا سکتی۔وہ تو اس کی یادوں کے سہارے ہی جیون کاٹ دینا چاہتی ہے۔کجری کے منہ سے یہ سب سن کر اور جوالا پرشاد کی شفقت بھرے برتاؤ اور کجری سے اس کی اپنائیت کو دیکھ کر بھائی پھر کچھ نہ بولا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔

اپنے لباس کا اور سلیقے کے ساتھ زندگی گزارنے کا اسے ہوش ہی نہ رہا تھا۔وہ اپنے آپ پر دھیان دینا اور اپنی پرواہ کرنا جیسے بھول ہی گئی تھی۔لیکن گاؤں والوں کو اس کی پرواہ ہونے لگی تھی۔وہ لوگ اس کی جوانی پر ترس کھانے لگے تھے۔عورتوں سے زیادہ مرد اس پر ترس کھاتے تھے۔کتنی جوان خوبصورت ہے مگر بے چاری ہمیشہ اکیلی رہتی ہے۔اکیلے اکیلے راتیں کیسے کاٹتی ہوگی۔

اور جو لوگ پہلے کبھی اس کے گھر نہیں آتے تھے، وہ اب آکر یہ پوچھنے لگے کہ وہ شہر جا رہے ہیں، وہاں سے کچھ منگوانا ہو تو بول دے۔وہ خوب جانتی تھی کہ یہ جھوٹی ہمدردی دکھانے والے گاؤں کے مرد لوگ کام کے بہانے بس اس کے قریب آنا چاہتے ہیں اور اس سے اچھی پہچان کر لینا چاہتے ہیں۔کوئی نہ کوئی غلط آس لگا کر۔لیکن وہ اپنے ہی گاؤں کے لوگ تھے اور وہ ان کو دھتکار نہیں سکتی تھی۔ایسے بدنیت اور خراب لوگوں کو ٹال دینا ہی اس جیسی عورتوں کے لیے ٹھیک رہتا ہے۔

لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، گاؤں کے لوگ اس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے تھے۔اس کے لیے ان کی نظریں ہی جیسے بدل چکی تھیں۔جب وہ گاؤں کی گلیوں میں سے آدھا گھونگھٹ کیے نکلتی اور ایک نظر ادھر ادھر دیکھ لیتی تو وہ یہ جان لیتی کہ دالان میں بیٹھے ہوئے گاؤں والوں کی للچائی ہوئی نظریں بس اسی کو گھور رہی ہیں۔ان نظروں میں اس کے لیے ہمدردی ہونے کے بجائے بے ایمانی، ہوس اور اس کا قرب پا لینے کی تمنائیں ہوتی تھیں۔اور یہ کچھ کم تعجب کی بات نہ تھی کہ سب کے دکھ درد میں کام آنے والا گاؤں کا سماج اب جیسے ایک رائے ہو کر اس کا یعنی اس کی جوانی کا بیری ہو گیا ہے۔وہ سب ایک دوجے کے لیے تو اچھے تھے لیکن برے تھے تو اس دکھیاری کے لیے۔ایک بیوہ سبھی کی ہمدردی کی

مستحق ہوتی ہے لیکن وہ سب اس کی جوانی اور اس کی خوبصورتی کے دشمن تھے اور اسے برباد کر دینا چاہتے تھے۔ وہ سب کے سب اسے چور لٹیرے نظر آنے لگے تھے۔

اور پھر غضب ہی ہو گیا۔

سسر جوالا پرشاد کے برتاؤ میں بھی تبدیلی آنے لگی تھی۔ کچھ ایسی تبدیلی جو اسے اچھی نہیں لگی۔ وہ اس سے ہنس کر یا مسکرا کر بات کرنے لگا تھا۔ یعنی اس میں دلچسپی لینے لگا تھا اور اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اور کھیت کھلیان یا کنویں پر جانے کے بجائے اب وہ گھر میں زیادہ رہنے لگا تھا اور جب جب وہ آنگن میں بغیر گھونگھٹ کے ہوتی تو ایک دم سے سامنے آ جاتا اور اس کا چہرہ دیکھ لیتا اور پھر بات کرنے لگتا۔

''اے کجری، دن میں کا کرت رہے۔ کنویں پہ آ جایا کر۔''

یا

''کپڑے لتے کی کوئی جرورت ہو تو موسے بے کھٹک بول دیجو اور سرم ناہیں کریو۔ اب تھارو دھیان تو موئے ہی دھرنا پڑے ہے......'' وغیرہ۔

تو کیا سسرے کی نیت بھی؟ وہ سوچتی اور ڈرنے لگتی۔ باگڑ ہی کھیت کو کھانے چلی ہے۔ وہ تو اسے باپ کی طرح سمجھتی تھی لیکن یہ کیا کہ بیٹے کی موت کے بعد وہ باپ جیسا نہ رہ کر ایک غیر آدمی جیسا برتاؤ کرنے لگا تھا۔ اور زیادہ تعجب کی بات یہ کہ وہ اپنی حدود سے ہی آگے بڑھنے لگا تھا۔ دالان کے داسے پر ہاتھ پاؤں دھوتے دھوتے دھوتی کو اوپر رانوں تک اٹھا لیتا۔ اس طرح کیا وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا شریر ابھی بوڑھا نہیں ہوا ہے۔ اور کیا وہ یہ بتانے کی بھی کوشش کر رہا ہے کہ اس کی بہو اس کے بیٹے کو دل سے نکال کر اور پچھلی زندگی کو بھول کر خاموشی سے اس کی عورت بن جائے۔ اور وہ بڈھا بڑھؤ پھر سے جوان بن کر اس کے سریر کا مالک بن جائے۔ ایسا کدی ہو سکے ہے......؟ یہ تو بھوت بے سری کی اور پاپ کی بات ہے...... رام دئی......

اور پھر ایک رات —— جب کہ وہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اور بستر پر سونے کے لیے جانے سے پہلے بھنڈریا (اسٹور) کے دروازے کی کنڈی لگا رہی تھی تو سسر نے آواز دی۔ وہ گھونگھٹ کیے ہوئے ہی آہستہ آہستہ اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی تو وہ بولا۔

''دن بھر کھیتن میں کام کرت کرت تھک گیا ہوں۔ پورے سریر میں درد ہو ریا ہے...... تنک داب دے......''

وہ سناٹے میں آگئی۔ اس کی بات سن کر آگے بڑھی اور گھنوچی پر رکھے مٹکے میں سے پانی پی کر بجائے جوالا پرشاد کے پاس جانے کے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ دماغ ایک دم سے گرم ہو گیا تھا۔ ثابت ہو گیا کہ بڈھا سچ مچ بری نظر رکھتا ہے اور اسی سے جسمانی تعلق قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی باگڑ اٹھ کر کھیت کھانے کو تیار ہو گئی ہے۔ اب کھیت کیا کرے۔ کدھر جائے؟ وہاں اس کے مائیکے میں بھی کیا رکھا ہے۔ بھائی بھاوج ہیں سو وہ غریب ہیں اور اس کی بھوجائی بہت کنجوس اور خراب عورت ہے۔ سال چھ مہینے بھی نہیں پٹ سکے گی اس سے۔ اور پھر خراب نظر والے آدمی لوگ تر ہر جگہ ہیں۔ پھر اب وہ کس کا سہارا لے۔ بے سہارا عورت تو اس سنسار میں ٹھیک سے جی ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی سہارا، کوئی نہ کوئی اپنا ہونا تو ضروری ہے۔ وہ سوچنے لگی اور سوچتے سوچتے سو گئی۔

بہو اور سسر میں کچھ کھنچاؤ سا ہو گیا تھا۔ کجری اسے نہ قریب آنے کا موقع دیتی تھی اور نہ زیادہ بات کرنے کا۔ اس نے کنویں اور کھیتوں پر جانا ہی چھوڑ دیا۔ دن میں وقت گزاری کے لیے گاؤں میں کسی نہ کسی عورت کے یہاں جا کر بیٹھ جاتی۔ لیکن پھر روزانہ وہاں بیٹھ کر بھی دل گھبرانے لگا تو سوچنے لگی کہ کیا کروں، کدھر جاؤں، یہ جیون تو اب پہاڑ جیسا ہو گیا ہے اور دن بہت لمبے لمبے۔ ہے بھگبان...... جے موپے کسو ٹیم آ گیو......

بنسی کے مرنے کے بعد جوالا پرشاد ہی گھر کا غلہ بیل گاڑی میں بھر کر کبھی اسے بیچنے تو کبھی گھر کا سودا سامان لینے اور چکی سے آٹا پسانے اتوار کے دن چرنال کو یا پھر جمعہ کے دن شامپور کو چلا جاتا تھا کہ ان دنوں میں وہاں ہفتے کی ہاٹ لگتی تھی۔ وہ دوپہر کو گھر سے نکلتا تھا تو پھر شام تک ہی واپس لوٹتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اور گھر سے کبھی کبھی دور رہنے کے لیے کجری نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے سسر سے کہہ دیا کہ گبرو کو ساتھ لے کر غلہ بیچنے، آٹا پسانے اور ہاٹ بازار کرنے اب وہ ہی بیل گاڑی لے کر چرنال اور شامپور جایا کرے گی، کیونکہ گھر میں ہمیشہ ہی بے کار بیٹھے بیٹھے اسے اچھا نہیں لگتا۔ سسر کچھ نہ بولا۔ خاموش رہ کر اسے اجازت دے دی۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کھیتی کے اور گھر کے کاموں کے لیے دو ہالی (کارندے) تھے۔ ایک نتو بلائی اور دوسرا گبرو دیسوالی۔ ہاٹ بازار یا قصبے کو بیل گاڑی جوت کر گبرو ہی اکثر جوالا پرشاد کو لے جاتا تھا۔ کجری نے گبرو سے کہہ دیا کہ ہاٹ بازار کرنے اب وہ ہی اس کے ساتھ جایا کرے گی۔

پہلی بار اتوار کی ہاٹ کرنے اپنے بلودیا گاؤں کے مشرق میں واقع دو کوس دور چرنال کے لیے روانہ ہوئی تو راستے بھر اسے بیل گاڑی میں بہت اچھا لگا۔ گبرو بیل گاڑی بہت اچھی ہانکتا تھا۔ گڑواٹ (بیل گاڑی کا راستہ) جہاں اچھی ہوتی تھی وہ بیلوں کو خوب دوڑاتا تھا۔ اور جب بیل دوڑتے تھے تو ان کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیاں جنگل کی پرسکون خاموشی کو سنگیت سے بھر دیتی تھیں۔ گھر کی فکر اور دماغ کی ساری پریشانیاں جنگل کے خوشگوار سفر سے کچھ دیر کو تو ذہن سے غائب ہو ہی گئی تھیں۔ پھر چرنال کی ہاٹ میں بہت اچھا لگا۔ گبرو نے گھر لایا ہوا سویابین بیچ دیا اور چکی سے آٹا پسا لایا اور خود وہ نیچے زمین پر قطار میں تنبو لگا کر بیٹھے دکانداروں سے ساگ سبزی، سرخ مرچ، گڑ اور دیگر اشیاء خریدتی رہی اور پھر بعد میں اس نے برگد کے درخت کے نیچے عارضی طور پر بنائی گئی لمبے لمبے بالوں والے شانتی لال حلوائی کی دکان سے گرم گرم بھجیے بھی کھائے۔ وہاں موالی قسم کے دو چار لڑکوں نے اسے للچائی نظروں سے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر کچھ غلط بولے بھی تھے مگر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ پھر دن ڈھلنے کے پہلے ہی اس نے گبرو سے گاڑی جتوائی اور اپنے گاؤں کو لوٹ گئی۔

پھر قریب بیس دنوں کے بعد جمعہ کی ہاٹ بازار کے لیے وہ گبرو سے ہی بیل گاڑی جتوا کر شاہپور کے لیے روانہ ہو گئی جو اس کے گاؤں سے جنوب میں واقع تھا۔ بازار کر کے وہ شام کو دیر سے لوٹی کیونکہ شاہپور دور تھا۔ پورے تین کوس۔ تھک ہی گئی تھی۔ لیکن یہ تھکن اچھی لگی۔ جنگل میں بیل گاڑی سے سفر کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور دوڑتی ہوئی بیل گاڑی میں بھی تو ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے برسات کا موسم آتے ہی زندگی سے عاری اور ویران سی نظر آنے والی ندی یکا یک ایک خوشگوار شور کرتی ہوئی دوڑنے بھاگنے لگے۔

گھر سے باہر نکلنے کا یہ سلسلہ پھر چل ہی پڑا۔ اب تو گبرو کا بہت ساتھ ہو گیا تھا۔ تیز دوڑنے کے بعد جب بیل تھک جاتے ہیں تو پھر گاڑی بہت دھیمی دھیمی چلتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بارش کا موسم گزر جانے کے بعد ندی کا بہاؤ اور اس کی آواز دونوں مدھم ہو جاتے

ہیں۔ ایسے میں وہ آس پاس کے جنگل کو اور گیہوں چنے کی فصل کے ہرے بھرے کھیتوں کو بہت دلچسپی سے دیکھتی۔ گاڑی چلتی رہتی اور وہ دیکھتی ہی رہتی۔ گڑواٹ کے قریب ہی بر جھڑی اور کروندے کی جھاڑیوں میں سے اور جہاں جہاں گھاس اگی ہوئی ہوتی تھی تو گھاس میں سے چھوٹی چھوٹی بٹیریں پُھر سے اڑ جاتیں۔ نیلے اور سفید آسمان میں اڑتے پرندے اور راستے کی پارو آندی کے کنارے بیٹھے ہوئے سفید سفید بگلے اس بات کا واضح اظہار کرتے تھے کہ بستی کی دنیا سے جنگل کی دنیا زیادہ خوبصورت اور پر سکون ہے جہاں من کو بہت شانتی ملتی ہے۔ ایسے راستوں پر کجری اپنا دکھ درد بھولنے لگی تھی۔ بنسی کی جدائی کا صبر تو آ گیا تھا مگر جنگل میں کبھی کبھی اس کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ ساتھ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

گھر میں سسر کو اپنے قریب دیکھ کر اسے ایک دم غصہ آ جاتا تھا۔ وہ قریب نہ بھی ہوتا تب بھی ایسا لگتا کہ جیسے گھر کے کسی بل میں کہیں نہ کہیں کوئی زہریلا سانپ چھپا ہوا بیٹھا ہے جو اس کی گھات میں ہے۔ لیکن جب وہ کسی قصبے کو جاتے ہوئے بیل گاڑی میں سفر کرنے لگتی تو دماغ کا سارا تناؤ دور ہو جاتا۔ اور یہ جنگل کے ماحول کا ہی اثر تھا کہ اب اس کا دل گدگدانے لگتا اور کبھی کبھی مچل اٹھتا۔ کچھ شرارت کرنے کو یا پھر...... کسی کی بانہوں میں ...... ہائے دیا...... یہ کیا آنے لگا ہے اس کے دماگ میں۔ وہ چونک سی جاتی۔ کیا وہ بھول گئی کہ وہ ایک ودھوا عورت ہے اور اب ایسا کچھ سوچنا بھی اس کے لیے پاپ ہے۔ لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ اپنے آزاد خیالات کو کتنا بھی بس میں کرے لیکن اس کے دل و دماغ میں تو تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اور دل و دماغ زندگی کو ہنسی خوشی اور مستی میں شامل کرنے کو تیار ہو رہے ہیں۔ اور ان پر کسی قسم کی پابندی لگانا اب اس کے بس میں نہیں رہا کیونکہ اپنے دل و دماغ سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ سب جنگل کے دلکش ماحول کا اور جنگل کی نشہ آور بھینی بھینی خوشبودار ہواؤں کے باعث ہی تھا۔ لیکن یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھی کہ جنگل کا یہ ماحول اس کا کچھ بُرا کرنے جا رہا تھا یا اس کے لیے کچھ بہتر کر رہا تھا۔

ہلکی سردیوں کے دن تھے۔ ایک ماہ میں دو بار تو ضرور ہی وہ گاؤں کے کسی قصبے کو بیل گاڑی لے کر جاتی۔ گبرو ہی بیل گاڑی ہانکتا تھا اور وہ اس کے پیچھے، اس سے ذرا ہی دور بیٹھ کر دن بھر کے سفر سے لطف اندوز ہوتی۔

اور پھر اس طرح کے سفر کے دوران ہی واپس گاؤں لوٹتے وقت ایک سہ پہر کو جب اسے راستے میں پیاس لگی تو گبرو گاڑی روک کر کچھ دور پر کھڑے آم کے درختوں کے پاس کی ایک جھونپڑی سے اس کے لیے پانی لے آیا۔ جب وہ نیچے کھڑا ہوا اس کے ہاتھوں کی اوک میں لوٹے میں سے پانی ڈال کر اسے پلاتا رہا تو اس وقت پہلی بار اس نے گبرو کے قرب اور اس قرب میں شامل اپنائیت کو محسوس کیا۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ بنسی کی طرح ہی بہت محبت سے گبرو اسے پانی پلا رہا ہے۔

وہ بنسی کے جیسے ہی ڈیل ڈول کا تھا۔ ابھی تک کنوارہ تھا اور عمر میں بنسی سے بس ایک دو سال ہی چھوٹا تھا اور اسی کی ذات کا یعنی دیسوالی سماج کا تھا۔ تھوڑا سانولا تھا مگر تھا کتنا اچھا۔ سر کے بالوں میں مسالے والا خوشبودار تیل چپڑے رہتا تھا۔ گاڑی کے چلتے وقت جنگل کی خوشبو میں مل کر اس کے بالوں کی خوشبو مست کر دیتی تھی۔ جی ہوا کہ جنگل کی تنہائی میں وہ اس سے سٹ کر بیٹھ جائے اور اپنے اکیلے پن کو ایک دم سے دور کر دے۔ لیکن تبھی اسے خیال آیا کہ وہ تو ایک بیوہ ہے، اگر کسی نے یہ جان لیا کہ اب پھر اس کے پر نکلنے لگے ہیں تو بڑی تھو تھو ہوگی۔ گاؤں والے اس کی گت خراب کر دیں گے۔ اس نے اپنی امنگوں اور ارمانوں کو کوسا کہ ایک بار سو جانے کے بعد وہ جاگے ہی کیوں۔ پھر اس نے گاؤں والوں کو اور اپنے سسر کو کوسا کہ اگر وہ سب اس کے شریر پر غلط نظر نہ ڈالتے اور اس پر اپنی نیت خراب نہ کرتے تو اس کا دھیان بھی ان باتوں پر جاتا ہی نہیں اور اس کے سوئے ہوئے ارمان بھی جاگتے ہی نہیں۔

لیکن خیالات تھے کہ آج اس کے دماغ میں دوڑے چلے آ رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ جب سے بنسی گیا تھا وہ کتنی اکیلی ہو گئی تھی۔ ایک بس یہ گبرو ہی تو تھا جو گھر کے کام کاج میں اور ہاٹ بجار کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اگر بنسی کی جگہ وہ گبرو کو دے دے...... اور...... اپنا ہاتھ...... اس کے ہاتھ میں دے دے...... تو......؟

بیل گاڑی تیز چل رہی تھی۔ کچھ دوڑ سی رہی تھی اور گاڑی کی طرح ہی اس کے دل و دماغ بھی دوڑ چلے تھے۔ رکنا ہی نہ چاہتے تھے۔ من کہتا تھا کہ آج بیل راستہ بھول جائیں اور یہ گاڑی کسی سنسان جنگل میں راہ بھول کر کہیں رک جائے...... اور پھر...... رات ہو جائے۔

راستہ خراب تھا۔ جا بجا گڈھے تھے۔ وہ کچھ آگے سرکی اور گاڑی میں ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس طرح کہ اس کا ایک گھٹنا گبرو کی پیٹھ سے ٹکرانے لگا۔ گاڑی ہلتی تھی اور گھٹنا گبرو کی پیٹھ سے ٹکرا جاتا تھا۔

گبرو کی نظر سامنے سڑک پر تھی۔ لیکن دھیان اس کا ہر طرف سے سمٹ کر پیچھے کجری کے گھٹنے کی طرف چلا گیا تھا۔ کام کاج میں وہ اس سے کتنا بھی قریب رہا ہو لیکن خراب نظر، خراب نیت اور خراب ارادے ہمیشہ اس سے اتنے فاصلے پر رہے تھے کہ پہلے کبھی اس کے دل و دماغ کو چھو بھی نہ سکے۔ لیکن اب ...... وہ فاصلے...... اچانک نزدیکیوں میں بدلنے کو بے قرار ہو گئے۔ کجری اس کے بہت نزدیک تھی...... اور اس کا گھٹنا اس کے جسم میں سنسنی دوڑا دیتا تھا...... اس نے کجری کا پیغام سمجھ لیا تھا۔

اس نے گاڑی کی رفتار بیلوں کی راس کو ڈھیل دے کر سست کر دی۔ قریب نظر آنے والے آم کے اونچے درختوں سے اوپر آسمان کو دیکھتے ہوئے اور گاڑی گھیرتے ہی وہ ایک دیہاتی گیت گنگنانے لگا۔

شام ہو چلی تھی۔ مغرب کی جانب سے ڈوبتے سورج کی لال روشنی اب بھی ان دونوں پر اور بیل گاڑی پر پڑ رہی تھی۔ لیکن مشرق کی سمت سے اندھیرے بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اور پھر سورج مزید کمزور پڑا تو ہوا میں بھی خنکی آگئی۔ لیکن خنک ہوا کا احساس تو باہر باہر تھا، اس کے اندر تو دل و دماغ دونوں ہی گرم ہوتے جا رہے تھے، اور ساتھ ہی دل بے قابو ہوا جا رہا تھا، کجری کے قرب کے احساس سے۔

گڑواٹ کے ایک دوراہے پر اس نے بیلوں کی راس کچھ اس طرح کھینچی کہ بیل اس کے گاؤں کا راستہ چھوڑ کر ایک دوسری راہ پر چل پڑے۔ جب من بھٹک جاتے ہیں تو کبھی کبھی راہ بھی بھٹک جاتی ہے۔ کجری دیکھ سمجھ رہی تھی مگر بولی کچھ ہیں۔ وہ انجان سی بنی دور افق کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''بیل پیاسے لگت ہیں'' وہ کجری سے بولا'' اس کارن دھیرے چلت ہیں۔ ندی پر ان کو پانی پلا دئی ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ ان کو پانی پلات چلو۔''

''نہیں ...... دیر ہو تو پھر رہن دیں؟''

''جلدی کائے کی ہے ...... بیلن کو پیا سے مارنا کوئی ٹھیک بات ہے کا؟''

گبرو میں جیسے شیر کا سا جوش آ گیا۔ وہ مغرب کی جانب دیکھنے لگا جہاں لال رنگ کا سورج کا گولا آدھا ڈوب چکا تھا اور اب بس آدھا ہی اوپر رہ گیا تھا۔ وہ بس ڈوبا کہ اندھیرا آیا۔ اور اندھیرا آیا تو ...... پھر یہ دوریاں بھی ...... جلد ہی ...... اس کے بدن میں پھریری سی آ گئی اور وہ کجری کو بہت پیار سے دیکھنے لگا۔

قریب دس بجے رات بیل گاڑی گھر پہنچی تو مہاوٹ کی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ جوالا پرشاد کے تیور بہت خراب نظر آئے۔ گبرو نے پہلے ہی بتانا شروع کر دیا کہ پہلے تو سویابین خریدنے والا ویاپاری شہر سے دیر میں آیا۔ پھر ہاٹ میں سے ایک بیل گھاس چرتے چرتے جنگل کی طرف بھاگ گیا تھا کہ جسے ڈھونڈنے اور لانے میں دیر ہوئی۔

کجری کا من کھانا بنانے کا نہیں تھا مگر سسر کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہ ملے اس لیے چولہا جلانے بیٹھ گئی۔ پھر ذرا ہی دیر میں خاصی تیز بارش شروع ہو گئی۔ سسر باہر آنگن میں رکھی چیزیں اٹھا اٹھا کر دالان میں رکھ رہا تھا۔ اس نے بازار سے لائی ہوئی میتھی کی بھاجی کو توڑا اور پھر اس میں مونگ کی دال ملا کر سوکھی سوکھی سی دل بجھیا بھونی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ جوالا پرشاد کہیں اس سے بھی دیر سے آنے کا کارن نہ پوچھ بیٹھے، کیونکہ کسی پکڑے گئے چور کی طرح آج اس کے ہوش اڑے ہوئے سے تھے اور چہرے پر بہت گھبراہٹ تھی۔

اس نے پھر جلد ہی آٹا گوندھا اور روٹی پکانے لگی۔ اسی درمیان جوالا پرشاد سر پر کھادی کی ٹوپی لگائے اندر آ کر اور چولہے کے پاس بیٹھ کر آگ تاپنے لگا تو اس نے کھانا نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ غنیمت تھا کہ جوالا پرشاد اس سے کچھ بولا نہیں ۔ اور دھیرے دھیرے کھانا کھاتا رہا۔ اس کی عادت تھی کہ رات کے وقت روٹی کے نوالے چباتے چباتے کچھ دیر کو وہ آنکھیں بند کر لیتا تھا اور ایسے میں شاید وہ کچھ سوچتا بھی تھا اور جب تک وہ کھانا پورا نہیں کر لیتا تھا کجری کو وہیں بیٹھا رہنا پڑتا تھا۔

وہ چولہے کے پاس بکھرا ہوا سامان ادھر سے ادھر حفاظت سے رکھنے میں مصروف ہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ جوالا پرشاد کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد باہر گیا، وہاں

ہاتھ دھو کر اس نے کلی کی اور پھر اندر آ کر چولہے کے سامنے بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا اور پھر ایک انگارے کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس نے بیڑی سلگائی او پھر منہ میں دبالی۔ اس نے سوچا کہ اب بھی وہ یہاں بیٹھا رہنا چاہے تو بیٹھا رہے۔ اس کا کام تو ختم ہو ہی گیا ہے۔ سونے کے ارادے سے جانے کے لیے وہ اٹھی ہی تھی کہ جوالا پرشاد بولا۔

''اے کجری...... جرا سُن تو......؟

کجری بیٹھ گئی۔ لیکن اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''بھوت دنوں سے میں ایک بات تو سے کہنا چاریا ہوں۔''

کجری سمجھ گئی کہ یہ چھپا ہوا ناگ آج سامنے آ ہی گیا۔ وہ شاید سمجھ گیا ہے کہ آج جو بیل گاڑی دیر سے آئی ہے تو اس کے اور گبرو کے درمیان ضرور کچھ ہوا ہوگا۔ اور اسی لیے اب یہ گھاگھ بڈھا بھی دیر کرنا نہیں چاہتا۔ اور اب آدھی رات کو کہ جب سارا گاؤں سویا پڑا ہے تو اکیلے میں وہ کسی بھی وقت اس پر حملہ کر سکتا ہے۔ ایسی بارش میں، اتنی رات کو اور ایسے بھیانک اندھیرے میں وہ کیسے بھاگے گی۔ یہ بڈھا تو اس عمر میں بھی بلوان ہے۔ وہ اگر چلائی بھی تو اس کی آواز سنے گا کون۔

اے بھگبان...... میں آج کیسی بپتا میں پھنس گئی رہے...... بنسی کے مرنے کے بعد اپنے مائیکے ہی چلی جاتی تو ٹھیک تھا...... یا پھر آج گبرو کے سنگ ہی بھاگ جاتی تو بھی ٹھیک تھا......

''بنسی کو گئے دو برس بیت گئے ہیں۔ تو کب تک ایکلی رہے گی'' وہ بولا ''جوان منک کی جندگی اکیلی نہیں کٹ سکے ہے جسے ہم جانت ہیں۔ پھر بیّر (عورت) کو ایکلی دیکھ کے گاؤں والے بھی بری نجر رکھے ہیں......''

اصل مطلب پہ جلدی کیوں نہیں آتا۔ وہ سوچنے لگی۔ تھوڑا سا ٹھہر کر اور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر جوالا پرشاد پھر آگے بولا ''تُو بیاہ کر لے۔''

بے سرم بڈھے۔ کجری نے دل میں کہا۔ جرا اور کھل کے آ، پھر دیکھت ہوں تجھے۔

''دس بارہ سال سے ای گبرو اپن کے گھر کام کرے ہے۔ سمجھو کہ اپنا ہی ہے۔ جب تم دونوں جنے بیل گاڑی پہ چلو ہو تو تمری جوڑی اچھی لگے ہے۔ میں تو سوچوں ہوں کہ

تم دونوں جنے ایک ہو جاؤ......سادی کرلو......''

کجری کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔مگر جوالا پرشاد کہے جا رہا تھا۔''میں جانتا ہوں کہ تو اسے پسند کرے ہے اور وہ تجھے۔لیکن میں تجھے گبرو کے گھرے تو نئیں بھیجوں گا ہاں باکو بنسی مان کے اپنے گھر میں دھرلوں گا۔''

تب کجری دھیمی آواز میں بولی''اور جات برادری والے......؟''

جوالا پرشاد ہنسا''وہ سب سسرے ہمری مٹھی میں ہیں۔ان کو راجی کرنے میں کا دیر لگے ہے۔ایک بھوج دے دیں گے انہیں۔''

''جیسی تم ٹھیک سمجھو''۔

یہ کہہ کر کجری وہاں رکی ہی نہیں اور جا کر اپنے کمرے میں کھٹیا پر لیٹ گئی۔بہت سی باتیں سوچنے کے لیے۔نیند کب کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔

جوالا پرشاد بھی اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔نیند تو اس سے بھی کوسوں دور تھی۔کیونکہ آج بس کجری کا چہرہ ہی بار بار اس کے سامنے آ رہا تھا۔چہرہ اور پھر گھاگرا چولی میں اس کا بھرا ابھرا اور گدرایا ہوا بدن۔اس نے کروٹ لی۔اور آگے پھر کجری کے بارے میں سوچنے لگا۔وہ کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اس نے۔اور عورت ذات کو بھی وہ خوب جانتا تھا۔ابھی تو کجری کے نینوں میں وہ مشٹنڈا ہی سمایا ہوا ہے اور اس کے بھروسے وہ شیرنی بنی ہوئی ہے۔ابھی اگر وہ کجری پہ ہاتھ ڈال دے گا تو بات بنے گی نہیں۔وہ گاؤں مین اس کی عجت کھراب کردے گی اور ہاتھ سے بھی چلی جائے گی۔اس معاملے میں تو کچھ زرات سے ہی (صبر سے) کام لینا ہوگا۔اس کی جوانی کدھر بھاگی جات ہے۔آئے گا موکا (موقع)......کوئی موکا ایسا جرور آئے گا جب وہ کجری پہ ہاتھ دھر سکے گا۔جب لوہا گرم ہووے ہے تبھی تو اس پہ ہتھوڑا مارا جائے ہے......اور یہ گبرو ہے کا چیز...... اس کے ٹکڑوں پہ پلنے والا اس کا گلام......اور اس کا کرج دار...... گبرو کا بول بول کے وہ کچھ سے کھینچ سکتا ہے اور کجری کو دھیرے دھیرے شیشے میں اتار سکتا ہے۔کجری پہ ہاتھ دھرنے کے لیے اُچت سمے تو چاہئے......جو ابھی تو ہے نہیں......آئے گا کبھی ایسا سمے بھی......کہ جب گبرو دور دور رہے گا اور کجری کے کریب پھر وہ ہی وہ ہوگا......وہ ہی وہ......

اور اسی وقت کجری بھی اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کیے ہوئے سوچ رہی تھی۔
یہ بڈھا...... ہے بھوت مکار آدمی...... جو کچھ ابھی بولا تو اچھی نیت سے نہیں بولا
......اس کی نیت ایک دم کھراب ہے۔ کیا میں نے اس کی آنکھن میں اس کی کھراب ارادے نہیں پڑھ لیے۔ یہ ابھی گبرو کے لیے رجامند تو ہے۔ پن اس کا داؤ مجھ پہ ہی ہے۔ یہ سسرا مجھ کو آسانی سے نہیں چھوڑن چات ہے۔ پن میں بھی اچیت سمے پہ اسے ٹھکانے لگاؤں گی۔ کوئی بھی اچھی عجت دار عورت اپنی بے عجتی کرنے والے مرد کو ناگن کی نجر سے دیکھے ہے اور صحیح موکے اور سمے پہ ہی اسے ڈسے ہے۔ یہ سمجھت کا ہے اپنے آپ کو؟ بڈھا...... کھڑوس ......حرامی......!!

کٹھ پتلی کے دھاگے

اپنے فرنیچر کے شوروم پہنچ کر اور پھر قریب ایک گھنٹے میں کاغذی کام نمٹانے کے بعد جب مہیندر نے سگریٹ سلگائی تو اسے بہت اطمینان کا احساس ہوا۔ وہ اپنے کاروبار میں کامیاب تھا اور اس کی ازدواجی زندگی بھی خوش گوار تھی۔ پھر دکان اور کارخانے کے ملازمین بھی اسے ایسے وفادار ملے تھے جو اس کی غیر موجودگی میں بھی اس کے کاروبار کو ٹھیک طرح چلا لیتے تھے۔ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی اور جب قسمت ساتھ دے تو خوشیاں از خود ہی زندگی میں چلی آتی ہیں۔

اطمینان کی ایسی ہی گھڑیوں وہ مسرور ہو جاتا تھا۔ آج بھی مزاج میں وہ کیفیت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ایک معتمد نوکر جے سنگھ اس کے نزدیک آ کر واپس چلا جاتا تھا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ عموماً قرض لیتے وقت وہ اسی طرح جھجکتا تھا۔ جے سنگھ کو قرض دینے سے اسے کبھی کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ جے سنگھ اس کا معتمد نوکر ہی نہیں، اس کے گھر کے ممبر جیسا تھا۔

''ہاں بولو جے سنگھ، تم کچھ کہنا چاہتے ہو......؟''

''وہ...... آپ کو فرصت ہو تو......؟

''مجھے فرصت ہے۔ کچھ پیسے چاہیے کیا تمھیں......؟''

''نہیں...... پیسے کی بات نہیں بھیا...... کچھ گھر کی بات ہے۔''

''گھر کی بات...... وہ کیا ہے؟ بیٹھ جاؤ ادھر۔''

وہ...... ماں جی...... آپ کی ساس......''

"ہاں کہو...... بے جھجک کہہ دو......"

جے سنگھ قریب آ گیا اور بہت راز داری میں اس نے آہستہ آہستہ کہا اور جو کچھ کہا وہ مہیندر کے ذہنی سکون میں تلاطم لانے کے لیے کافی تھا اور صرف تلاطم ہی نہیں، اس بات نے تحیّر کے دریاؤں میں اسے غرض کر دیا تھا۔

کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ وہ بات یقین کرنے لائق تھی ہی نہیں لیکن جے سنگھ نے وہ بات کہی تھی۔ اس لیے یقین کرنے کو وہ مجبور تھا۔ جے سنگھ نے جھوٹ کبھی نہیں بولا تھا۔

دوپہر کو گھر جا کر وہی بات جب اس نے اپنی بیوی پشپا کو بتائی تو پشپا بھی حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہی تو میں کہتا ہوں کہ اماں ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو یہ بہت شرم کی بات ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔ اپنا جے سنگھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"لیکن میں یہ کیسے مان لوں کہ ماں مندر کے دروازے پر کھڑی ہوئی بھیک مانگ رہی تھی۔"

"جے سنگھ جب اپنے گھر گیا تھا تو اس نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا تھا۔ میں اس پر اوشواس (بے یقینی) نہیں کر سکتا اور مجھے یہ سب کچھ صحیح اس لیے لگتا ہے کہ تمہارا بھائی کمل شراب اور عیاشی میں اب اتنا ڈوب چکا ہے کہ اس کا فوٹو اسٹوڈیو بھی اب قریب قریب بند ہے۔ پریشان ہو کر ماں بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئی ہو گی۔ لیکن ایسا اسے قطعی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا اسے ہماری عزت کا کچھ خیال نہیں۔"

اس کی بیوی منہ پھیر کر آنسو بہانے لگی۔

دو روز بعد ہی تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد وہ اپنی کار سے بیوی کے ساتھ اپنی سسرال کے شہر پہنچ گیا اور بیوی نے جب اپنی ماں سے مندر پر بھیک مانگنے کی خبر کی تصدیق چاہی تو آنسو بہاتے ہوئے ماں نے الٹے ان سے فریاد کی۔

"میں کیا کرتی۔ لڑکا اب کسی کام کا رہا نہیں۔ رات دن کسی نہ کسی کے ساتھ

شراب پیتا ہے اور کام دھندہ بالکل نہیں کرتا۔''

''تو تم میرے پاس آ جاتیں ماں، تمہیں ہماری عزت سے کھیلنے کا کیا اختیار ہے۔''

میں نے جو مانگا بھگوان کے گھر سے مانگا تھا۔ میں تو پہلے پہلے پھول مالا بیچنے گئی تھی۔ لیکن لوگوں نے بوڑھی کمزور پر دیا کر کے اور اپنا سمجھ کر میری مدد کرنا شروع کر دیا۔''

''جسے تم دیا کہتی ہو اماں وہ دیا و یا کچھ نہیں، بھیک ہے بھیک'' مہیندر نے تیور بدلتے ہوئے کہا۔

''اب تم اسے بھیک کہہ لو، میں نہیں کہتی۔''

مہیندر دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر جب شام کو سالا کمل آیا تو اسے بھی برا بھلا کہا۔ پھر رات میں بیوی سے مشورہ کر کے مہیندر ساس اور سالے دونوں کو ساتھ ہی اپنے شہر لے آیا اور پھر چند روز بعد ہی سالے کو ایک فوٹو اسٹوڈیو کھلوایا اور ایک مکان اسے کرایہ سے دلوا کر ساس اور سالے دونوں کو اس میں ٹھہرایا۔ کمل اپنے بہنوئی سے ڈرتا تھا اس لیے قاعدے سے اسٹوڈیو چلانے لگا اور ماں کو بھی آرام دینے لگا۔ اور تب ایک دن مہیندر نے بیوی سے کہا۔ ''وہ تو یہ اچھا ہوا کہ وقت پر بات معلوم ہو گئی تو معاملے کو سنبھال لیا گیا اور عزت بچ گئی، ورنہ کچھ زیادہ دن ہو جاتے تو بہت بدنامی ہوتی۔ عزت تو ہمیشہ کو چلی ہی جاتی۔''

مہیندر اپنے سالے پر پوری نظر رکھ رہا تھا۔ کبھی دوپہر میں اسے اس کے اسٹوڈیو جا کر چیک کرتا تو کبھی رات کو اسے اسٹوڈیو سے لے کر اس کے گھر چھوڑ آتا اور یہ بھی دیکھتا کہ وہ اپنی ماں کو کھانے اور کپڑے کی ساری آسانیاں دے رہا ہے یا نہیں۔ کبھی وہ تو کبھی اس کی بیوی شکنتلا اماں کو کپڑے اور روپے دے آتے اور کبھی گھر بلا کر اسے دو دو تین تین دن اپنے یہاں مہمان بھی رکھتے۔

مہیندر کا سسر کپڑے کی ایک دکان پر سیلس مین کا کام کرتا تھا اور اپنی آخری سانس تک عزت ایمان داری اور خودداری کے ساتھ جیا۔ اور جب ہارٹ اٹیک سے مرا تو رشتے داروں کے علاوہ جان پہچان والوں نے بھی اس کی موت کا غم منایا مہیندر کو فخر تھا کہ اس کا سسر ایک آدرش وادی انسان تھا۔ لیکن شوہر کی موت کے بعد شکنتلا اماں کو اپنے شوہر کی موت کا صدمہ اتنا ہوا تھا کہ اسکا دماغ ہی چل گیا۔ ہر کچھ بکنے لگتی تھی۔ اور دماغ کا توازن

پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ مہیندر نے سوچا کہ یہ شاید اس کی بگڑی ہوئی ذہنی حالات کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ پریشانی میں بھیک مانگنے پر آمادہ ہوئی۔ لیکن اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ سالا بھی ٹھیک طرح کام کر رہا تھا اور ماں کو بھی بہ ظاہر کوئی فکر نہیں تھی جب کبھی اپنے بیٹی داماد کے پاس آتی تو خوش وخرم نظر آتی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب کبھی اپنے شوہر کو یاد کرتی تو بے تحاشہ آنسو بہانے لگتی اور ہر کچھ بکنے اور بڑبڑانے لگتی۔ ایسے وقت لگتا تھا کہ اس نے اپنا ذہنی توازن وقتی طور پر کھو دیا ہے۔

کوئی تین سال گزر گئے۔ اس دوران کمل کی شادی ہوئی اور اس کے یہاں ایک لڑکا بھی ہوا۔ کمل کی بیوی پہلے تو شکنتلا اماں کے ساتھ کچھ ٹھیک رہتی تھی لیکن پھر اس کے رویے میں فرق آ گیا۔ ساس اور بہو میں کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہونے لگی تھی۔ بیٹے کی ساری آمدنی بہو رکھتی تھی جس سے شکنتلا اماں کے ہاتھ خرچ میں بھی فرق آیا اور وہ پھر سے اداس رہنے لگی۔ مہیندر کو اب اتنا وقت میسر نہیں تھا کہ وہ سالے کے کام دھندے کو جا کر دیکھتا یا اس سے اس کی پریشانیاں پوچھتا۔

اتوار کی ایک صبح مہیندر بیوی کے ساتھ کار میں ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ اس نے شکنتلا اماں کو دیکھ کر کچھ فاصلے پر کار روک دی۔ اس نے دیکھا کہ برلا مندر کے باہر دیوار پر تین چار بوڑھی عورتوں کے ساتھ شکنتلا اماں آنکھیں بند کیے بیٹھی ہے اور وہاں گزرنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی اس کے سامنے روپے ڈال دیتے ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر مہیندر اور پشپا کے ہوش اڑ گئے۔ یعنی شکنتلا اماں نے پھر بھیک مانگنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے لیکن بولا انھوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں۔ اب بولنے یا کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ بڑھیا سرِ راہ ان کی عزت نیلام کر رہی تھی۔ کیا پتہ ان کے شناساؤں میں سے کس کس نے اِسے اس حالت میں بھیک مانگتے دیکھا ہوگا۔ اگر کسی ایک نے بھی دیکھ لیا ہوگا تو ان کی عزت تو سمجھو کہ گئی۔ پشپا کار سے اتر کر شکنتلا کو لینے مندر تک گئی لیکن مہیندر کار میں سر تھامے بیٹھا رہا۔

اور جب اماں کو لے کر وہ لوگ چلے تو مہیندر نے راستے میں اس سے ایک ہی سوال کیا "اب تمھیں بھیک مانگنے کی کیا ضرورت آن پڑی اماں۔ بیٹا ٹھیک سے کما رہا ہے

اور تم کو بھی کھانا اور کپڑے دے رہا ہے......''

یہ سن کر شکنتلا اماں رونے لگی اور روتے روتے پھر کچھ دیر بعد بولی ''بیٹا بہو مجھے تنگ رکھتے ہیں۔ ہاتھ خرچ کو کچھ نہیں دیتے۔''

''تو اس کے لیے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔'' بیٹی برس پڑی۔

''ہم لوگ مر گئے تھے کیا۔ ضرورت پر ہم سے روپے پیسے مانگ لیے ہوتے۔

جواب میں شکنتلا اماں کچھ نہیں بولی۔ ساڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

مہیندر سوچنے لگا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی بھیک مانگنے کی۔ سیکڑوں ہزاروں بوڑھے لوگ ہاتھ سے تنگ رہتے ہیں لیکن کبھی وہ بھیک تو نہیں مانگتے۔ بھوکے سوتے ہیں تب بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اس بڑھیا کو کیا ہو گیا ہے۔ شاید دماغی توازن کچھ بگڑ جانے کے باعث ہی وہ ایسا کر رہی ہے۔

گھر آکر مہیندر نے پہلا کام یہ کیا کہ شکنتلا اماں کو اپنے گھر میں اور اپنی نگرانی میں رکھنے کا فیصلہ سنایا۔ پھر اگلے ہی دن اس نے اماں کو شہر کے ایک معروف نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے اماں سے ماضی سے متعلق کئی باتیں پوچھیں جن کا جواب اس کی بیٹی پشپا نے دیا۔ ڈاکٹر بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ماضی میں کوئی پریشانی نہ ہوتے ہوئے بھی بڑھیا بھیک مانگنے پر کیوں آمادہ ہوئی۔ لیکن پھر بھی اس نے اماں کا علاج شروع کر دیا۔

مہیندر اور پشپا کو اطمینان تھا کہ اب شکنتلا اماں ان کے یہاں ٹھیک سے رہ رہی ہے۔ گھر میں بنے ہوئے کرشن جی کے مندر میں بھجن گاتی ہے یا پھر بچوں کو کھلاتی رہتی ہے۔ کھانے اور کپڑے کی اب اسے کوئی تکلیف نہ تھی۔ وہ جب بھی چاہتی تو اپنے ملنے جلنے والوں کے گھر چلی جاتی یا اپنی مرضی سے خوشی سے گھر کا سودا سلف لینے بازار چلی جاتی۔

لیکن پھر چند ماہ بعد ہی پشپا نے شکنتلا اماں میں ایک اور تبدیلی دیکھی۔ وہ پڑوس کے گھروں سے ترکاری لے آتی تھی اور گھر میں سب کے کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد کچن میں ایک طرف بیٹھ کر اکیلے ہی کھانا کھاتی تھی۔ مہیندر نے بھی یہ دیکھا تو ایک دن شکنتلا اماں پر بگڑ ہی گیا۔

''کیا ہمارے یہاں ترکاری اچھی نہیں پکتی جو پانچ سات گھروں کی ہنڈی کا مزہ

لیتی ہواور اس طرح تو تم ہمیں بدنام کر رہی ہو۔ آخر کیا بگاڑا ہے ہم نے تمھارا......؟

شکنتلا اماں پھر رونے لگی اور دو منٹ بعد جب رو چکی تو بولی ''کسی میں کوئی کھرابی نہیں، کھرابی تو سب میرے ہی اندر ہے، میں اب کسی کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تو اب اپنا بڑھاپا ہری دوار جاکر کاٹوں گی اور رام نام کرتے کرتے ہی کسی دن یہ پاپی سنسار چھوڑ دوں گی۔''

بڑھیا کی مکاری پر مہیندر کو بس غصہ ہی تو آ گیا۔ ایک دم سے بولا۔ ''اب تمھارے لیے ہری دوار ہی ٹھیک ہے۔ یہاں رہ کر تو تم ہماری عزت ہی خراب کروگی۔ تم کو اب اکیلے میں رام نام ہی کرنا چاہیے۔''

یہ سنتے ہی شکنتلا اماں نے اپنا سامان باندھ لیا اور ہر دوار جانے کی تیار کرنے لگی۔ پشپا کے سمجھانے پر مہیندر نے اماں کو جانے سے روکا بھی، مگر وہ بس ایک رات کے لیے ہی مانی...... اگلی صبح گھر والوں کے سو کر اٹھنے سے قبل ہی وہ گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ عجیب طبیعت کی انسان ہے۔ مہیندر نے سوچا...... کہ ساری آسائشیں میسر ہونے کے باوجود بھی وہ ہر ایک سے ناراض رہتی ہے اور روپے پیسے سے بے شرمی کی حد تک پیار کرتی ہے۔ بے شرمی بھی اتنی کہ بھیک مانگنے سے روکا تو پڑوسیوں کے گھروں سے ترکاری مانگ کر لانے لگی۔ ایسا کیوں ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ ایک قریب رشتے دار عورت نے ایک دن ہری دوار سے آکر بتایا کہ شکنتلا اماں ہری دوار میں خیریت سے ہے لیکن ہر ایک کو اپنی مجبوریاں اور رشتے داروں کا خراب برتاؤ بتایا کرتی ہے اور...... وہاں ایک مندر پر بلا ناغہ صبح صبح جاتی ہے اور لکڑی کی ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور...... بھیک مانگتی ہے۔

پشپا مہیندر کو اور مہیندر پشپا کو دیکھ کر رہ گئے۔ بولے کچھ نہیں۔ رات میں مہیندر نے دیکھا کہ بیڈ پر لیٹے لیٹے پشپا رو رہی ہے۔

''تو رنج مت کر'' مہیندر اسے سمجھاتے ہوئے بولا ''اماں اب ایسے ہی رہے گی۔ وہ ایسا کیوں کرتی ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم لوگوں کو اب اسے بھول جانا ہی ہوگا۔ اور یہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔''

اور تب پھر ان دونوں میں سے کسی نے شکنتلا اماں کے بارے میں کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ دن گزرتے رہے اور وہ بھولی بسری یاد بنتی گئی۔

اور پھر ایک دن...... سفید ریش اور سفید بھنوؤں والے ایک بزرگ تیاگی بابا ان کے گھر آئے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ ایک زمانے میں وہ تجارت کے ذریعہ اپنے شہر کے ایک بہت مال دار آدمی بن گئے تھے۔ لیکن جوان بیٹا مرا تو ساری دولت تیاگ دی اور جنگل جنگل بھٹکنے لگے۔ وہ جنگلوں اور دیہاتوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور موسم باراں میں پچمڑھی کے اس اونچے پہاڑ پر ایک کٹیا میں رہنے لگے تھے کہ جہاں سے سامنے کی بے شمار پہاڑیوں میں غروب آفتاب کا منظر اس ملک میں سب سے زیادہ دل کش اور پرکشش نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ تیاگی بابا بہت گیانی آدمی ہیں۔ انھوں نے آکر گھر والوں کو بتایا کہ بچپن میں پُشپا کے باپ اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے تھے اور بہت اچھے دوست تھے۔ پھر جب پُشپا چھوٹی سی تھی تو وہ اسے بڑے چاؤ سے اپنی گود میں کھلایا کرتے تھے۔ مہیندر نے ایسے نیک اور شفیق بزرگ کو مزید چند دنوں کے لیے روک لیا۔

مہیندر سے نہ رہا گیا تو ایک دن اس نے تنہائی میں شکنتلا اماں کا حل نہ ہونے والا عقدہ تیاگی بابا کے سامنے بڑی ہی رازداری میں رکھا۔ اماں کے بارے میں سب کچھ بتا کر اس نے پوچھا۔

''بابا کیا کارن ہے کہ بوڑھی اماں کو روپے پیسے سے اس قدر موہ ہے کہ بھیک مانگنے تک سے باز نہیں آتی۔''

بابا کچھ دیر تک خاموش رہے۔ جیسے کچھ سوچنے اور اس معمّے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر بولے۔

میں بھی یہ سمجھنے میں اسمرتھ (نا قابل) ہوں کہ روپے پیسے کا کوئی کشٹ نہ ہونے پر بھی دھن دولت سے اس کو اتنا موہ کیوں ہے کہ وہ بھکشا مانگنے پر اتارو ہو جاتی ہے۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ورِدّھ (بوڑھے) ہو کر کچھ لوگوں کا مستشک (دماغ) اتنا دُربل (کمزور) ہو جاتا ہے کہ ان کو اپنی اور اپنے گھرانے کی مان مریادا کا بھی کوئی خیال نہیں رہ جاتا۔ اس نے اچھا ہی کیا جو سارے رشتے ناتے تیاگ کر ہری دوار چلی گئی۔

بات آئی گئی ہوگئی...... پانچویں روز جانے کے لیے بابا اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر روکے سے بھی نہ رکے۔ مہیندر اپنی جیپ میں انھیں اسٹیشن چھوڑنے گیا۔ بابا ریل میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چھوٹنے میں بس ایک ہی منٹ باقی تھا کہ مہیندر سے وہ بولے۔

''تو نے میری اتنی سیوا کی ہے کہ پُتر تو میں تجھے وہ رہسیہ (راز) بتائے دیتا ہوں جو میں پچھلے پانچ دنوں سے اپنے اندر دبائے بیٹھا ہوں۔ اسے جان کر تُو اب اپنی ساس شکنتلا پر کرودھ (غصہ) نہیں کرے گا۔ وہ رہسیہ کی بات یہ ہے کہ شکنتلا کے دادا نے اپنے یوون (جوانی) کے دنوں میں اپنے گاؤں کے گھر میں کام کرنے والی ایک لڑکی کو اپنی واسنا (ہوس) کا شکار بنالیا تھا۔ گاؤں والوں کے وِوش (مجبور) کرنے پر شکنتلا کے دادا کو اسے اپنانا پڑا تھا۔ وہ ان کی پتنی نہیں تھی مگر گھر میں دوسری پتنی بن کر رہی۔ وہ لڑکی کچھ سندر تو تھی مگر...... وہ ایک بھکاری کی بیٹی تھی۔''

یہ کہہ کر تیاگی بابا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے اور مہیندر کے چہرے پر آئے تاثرات کو پڑھنے لگے اور پھر جلد ہی بولے۔

''انسان کا خون کبھی نہ کبھی بول کر رہتا ہے۔ ہر انسان کٹھ پتلی کے دھاگوں کی طرح اپنے پوروجوں (آباؤاجداد) کے خون سے اور ان کے سوبھاؤ مزاج سے بندھا ہوا ہے۔''

''لیکن شکنتلا اماں......''

''بڑھاپے میں اسے اپنی سوچ سمجھ پر نینترن (ضبط) نہیں رہا اور اب وہ کیول (صرف) بے دماغ کی ایک کٹھ پتلی ہے......''

''لیکن بابا میرے بچے......؟

''تم چنتا مت کرو۔ ان کے دھاگے تمہارے پوروجوں کے ہاتھوں میں ہیں، شکنتلا کے پوروجوں کے ہاتھوں میں نہیں......''

''اور کبھی اگر......''

ٹرین چل پڑی۔ بابا مسکرادیئے اور اس کو دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ ہلانے لگے۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور پھر ان کی ٹرین بھی۔

ایک عجیب وصیت

نیند کے دوران رات کو قریب تین بجے ولی میاں کو دل کا دورہ پڑا۔ کار میں انہیں ان کے دو بیٹے فوراً ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال گھر سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ سات آٹھ منٹ میں ہی پہنچ گئے۔ ڈیوٹی پر موجود دو جونیئر ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے کہا کہ Cardiac Arrest ہے۔ کارڈیولاجی کے سینیئر ڈاکٹر کامٹ بھی آدھا گھنٹے میں آ گئے۔ سبھی نے ان کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن زندگی سے ان کا ناتا صرف مزید دو گھنٹے رہا۔ پھر قریب پانچ بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ Cardiac Arrest نے دل کے آپریشن کا موقع ہی نہیں دیا۔

ولی میاں کی رحلت کی خبر صبح آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی۔ ان کے والد صوبے کے نوابی دور میں جاگیردار تھے۔ جاگیر میں ملی آدھی زمین قریب سوا سوا ایکڑ پر ولی میاں کا قبضہ تھا، اس لئے ان کی بُو باس میں جاگیردارانہ پن تھا۔ یار باش انسان تھے اس لئے ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ دوست بھی ایسے جو سیاست، ادب اور سماجی کاموں میں شہرت رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ ولی میاں کی شخصیت میں جاگیردارانہ رعب تھا اس لئے وہ سارے دوستوں پر حاوی رہتے تھے۔ عموماً اپنے دوستوں کو گھر پر دعوتیں دیتے تھے اور کانپور سے بلائے گئے ایک اچھے باورچی سے بنوا کر لذیذ کھانے کھلایا کرتے تھے۔ وہ ایک باذوق انسان تھے جو نہ صرف کلاسیکی موسیقی اور غزل گائیکی سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ شہر میں منعقد ہونے والے اردو کے پروگراموں کے ساتھ ساتھ مشاعروں میں بھی عموماً اپنے دوستوں کے ساتھ شرکت کرتے تھے اور اچھے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ان کے دو بیٹوں احسن اور محسن کا شہر میں الیکٹرانک سامان کا بہت بڑا شوروم تھا

اس لئے ان کے خاندان کو شہر کے بڑے رئیسوں میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ایک تو وہ شہر کے معروف آدمی تھے، دوسرے وہ کئی لوگوں کو، خصوصاً غرباء کو شادی بیاہ کے مواقع پر یا مصیبت کے وقت نوازتے رہتے تھے، اس لئے پورے شہر میں ان کے انتقال کی خبر سے رنج وغم کی لہر پھیل گئی۔لوگ اداس ہو گئے تھے اور عام طور پر لوگوں کے منہ سے یہی نکلتا تھا کہ ایک اچھا آدمی دنیا سے چل بسا جس کی کمی کو اب کوئی دیگر پُر نہ کر سکے گا۔

صبح آٹھ بجے ولی میاں کے وکیل دوست قدرت علی آ گئے جنہوں نے آتے ہی کہا کہ ولی میاں ان کو اردو میں ایک وصیت لکھوا کر دے گئے تھے اور مرحوم کی خواہش تھی کہ ان کی وصیت ان کے انتقال کے بعد لیکن ان کو دفن کئے جانے سے قبل، خاندان کے سبھی لوگوں کی موجودگی میں سنائی جائے اور اس پر عمل کرایا جائے۔

ولی میاں کا جنازہ ان کے بیڈروم میں رکھا تھا جہاں گھرانے کے دو لڑکوں کے ساتھ ایک بڑی مسجد کے تین حافظ صاحبان خاموشی سے قرآن شریف کی تلاوت کر رہے تھے۔اسی وقت ولی میاں کے دو بیٹوں احسن اور محسن نے خاندان کے موجود سبھی لوگوں کو ڈرائنگ روم میں جمع ہونے کو کہا۔جب سارے لوگ ڈرائنگ روم میں نیچے گدّے پر بیٹھ گئے تو ولی میاں کے وکیل نے ولی میاں کی وصیت کو پڑھنا شروع کیا۔وکیل کے مطابق وصیت دو حصوں میں تھی۔ایک حصہ ان کی جائیداد سے متعلق تھا اور دوسرا ان کی آخری خواہش سے متعلق۔

وصیت کے پہلے حصے میں تحریر تھا کہ ولی میاں کی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد بحصہ برابر ان کے دو بیٹوں احسن خاں اور محسن خاں میں تقسیم کر دی جائے۔اور بینک میں رکھی نقد رقم میں سے پچاس ہزار روپے وقف بورڈ کو غریب طلباء کی کتب اور فیس کی امداد کے لئے دیئے جائیں اور پچاس ہزار روپے اردو مدرسوں کی مرمت وغیرہ کے لئے دیئے جائیں۔اس کے علاوہ ان کی جائیداد سے ہونے والی آمدنی میں سے ان کے شہر کے اردو کے (افسانہ نگاری، مضمون نگار اور شاعری کے) تخلیق کاروں میں سے تین اچھے تخلیق کاروں (ایک کمیٹی کے ذریعہ انتخاب کئے جانے کے بعد) دس دس ہزار روپے بطور انعام ان کی جانب سے ہر سال دیئے جائیں۔

وصیت کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ کوئی قابل اعتراض یا ناپسندیدہ بات نہیں تھی۔ کسی کے چہرے پر کوئی شکن نہیں آئی۔ سبھی کو تجسس تھا تو وصیت کے دوسرے حصے کو سننے کا جس میں ولی میاں کی آخری خواہش درج تھی۔

وکیل صاحب نے پانی کے گلاس میں سے دو تین گھونٹ پیے اور وصیت میں تحریر ولی میاں کے لکھائے ہوئے جملوں کو پڑھنا شروع کیا۔

''یہ بات آپ سب کو بہت عجیب لگے گی لیکن میری یہ خواہش ہے کہ قبرستان میں میری کوئی علیحدہ قبر نہ بنائی جائے، بلکہ میری بیوی ارجمند آراء کی قبر کو کھود کر اور اسے چوڑا کر کے مجھے بھی اسی قبر میں اتار دیا جائے۔ اس کی موت کے بعد سے اس کی ایک سال کی جدائی میں نے بہت کرب سے گذاری ہے۔ اب موت کے بعد ہزاروں سال ایک الگ قبر میں رہ کر میں اس سے جدا نہیں رہ سکتا۔ عموماً کہا اور سمجھا تو یہ جاتا ہے کہ قبر میں جا کر انسانوں کے مردہ جسم خاک ہو جاتے ہیں، لیکن ہمارے مذہب میں یہ بھی ہے کہ مردہ جسم اور روح کا قبر میں کبھی نہ کبھی تعلق بنتا ہے۔ کم سے کم شبِ برات میں تو روحیں آزاد ہو کر نیچے زمین پر اترتی ہیں اور اپنی اپنی قبروں میں بھی پہنچتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ اس رات قبرستان میں اپنے اپنے عزیزوں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کیوں جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی ایک ہی قبر میں رہیں گے تو مجھے یقین ہے کہ ہماری روحیں جلد ملیں گی اور پھر ہم تا قیامت ساتھ رہیں گے۔ یہ میرے اپنے عقیدے کی اور آگے کے ہزاروں سال والی بات ہے۔ میری اس خواہش کا احترام کیا جائے اور ہم دونوں میاں بیوی کو ایک ہی قبر میں رکھا جائے۔''

وصیت کے اس دوسرے حصے نے سبھی کو چونکا دیا۔ خاندان والے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دبی زبان میں وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ میاں کی آخری خواہش کا پورا کیا جانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ایسا پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ کسی بھی مرنے والے کی آخری رسومات رواج اور دین کی ہدایات کے علاوہ کسی دیگر طریقے سے ادا کی جا سکتی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں تحریر کردہ اور غیر تحریر کردہ ہزاروں داستانیں ایسی ہیں جن میں دو محبت کرنے والے مرد و زن نے اپنی زندگی میں کئی مشکلات کے باوجود ایک ساتھ رہنے کے جتن کئے اور بے شمار ایسے جوڑے اپنے جتن میں کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن موت کے بعد قبر میں ایک ہو جانے

کی خواہش کا یہ پہلا معاملہ تھا۔اور شاید اس لئے تھا کہ ولی میاں کی مرحومہ بیوی ارجمند آراء نہ صرف ایک بہت خوبصورت عورت تھی بلکہ اپنے شوہر سے بے انتہا محبت کرتی تھی تو وہ بھی بیوی سے بہت محبت کرنے لگے تھے۔دوستوں کے ساتھ وقت گذارنے کے علاوہ جو بھی وقت ہوتا وہ دونوں ساتھ ساتھ گذارتے۔ جہاں بھی وہ جاتے تو بیوی ان کو اکیلا نہیں جانے دیتی تھی بلکہ خود بھی ان کے ساتھ ہو جاتی۔کسی کی دعوت میں یا شاپنگ کرنے شہر میں کہیں جانا ہو یا گاؤں میں کھیتی کی دیکھ بھال کرنے۔یعنی شادی کے بعد بھی ان دونوں میاں بیوی کا رشتہ عاشق و محبوبہ جیسا تھا۔

دو سال قبل ارجمند آراء کو پیٹ کا کینسر ہوا اور ممبئی میں ہر ممکن علاج کے باوجود دیکھتے دیکھتے ایک سال ہی میں وہ اس دنیا کو الوداع کہہ کر ولی میاں کو داغ مفارقت دے گئی۔ بیوی کی موت کے بعد سے وہ بہت بے چین رہا کرتے تھے۔دوستوں کو قریب چھوڑ رکھا تھا۔ ہر کبھی جیپ لے کر اپنے گاؤں چلے جاتے اور گھنٹوں جنگل میں کسی مقام پر یا ندی کنارے بیٹھے رہتے اور ارجمند آراء کو یاد کرتے رہتے۔اپنی زندگی میں اپنی بے انتہا محبت سے ارجمند آراء نے ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اپنا گھر کر لیا تھا اور مرنے کے ایک سال بعد تک وہ دل و دماغ سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ ممکن ہے، بیوی کی جدائی کا غم یا صدمہ ہی ان کے ہارٹ فیل کا باعث ہوا ہو۔ولی میاں کا انتقال باسٹھ سال کی عمر میں ہوا تھا جبکہ موت کے وقت ارجمند آراء کی عمر صرف چھیالیس سال تھی اور چھیالیس سال کی عمر میں بھی وہ گلابی رنگت کے چہرے کی ایک ہنس مکھ اور خوبصورت عورت تھی۔

بظاہر تو مرنے کے بعد سبھی خاک ہو جاتے ہیں اور جسم باقی نہیں رہتا لیکن شاید ولی میاں اپنی خاک کو بیوی کی خاک سے ملا دینا چاہتے تھے۔جو بھی ہو، یہ ان کی وصیت تھی اور وصیت میں ان کی آخری خواہش۔

تدفین سے قبل یہ ایک مسئلہ آ کھڑا ہو تھا۔خواتین خاموش تھیں لیکن گھر کے ہی مردوں نے کہا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے، کیونکہ قوم کے لوگ رواج اور شریعت کی ہدایات کے خلاف کوئی کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔دونوں بیٹوں نے فیصلہ کیا کہ ولی میاں کی اس وصیت اور آخری خواہش کو نزدیک کی مسجد کے مولوی صاحب اور محلے کے لوگوں کو بتا دیا جائے۔ان

لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو ابا کی خواہش پوری کر دی جائے گی۔

چنانچہ پُرسے کے لئے آئے ہوئے تمام لوگوں کو ولی میاں کی یہ وصیت اور آخری خواہش بتا دی گئی۔ سبھی حیرت زدہ ہوئے۔ پھر یہاں بھی چہ می گوئیاں ہوئیں۔ جلد ہی اختلاف کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ سائیکلیں کرایہ سے چلانے والے مولانا رئیس نے بہت روکھے لہجے میں کہا کہ ولی میاں کی اس خواہش کے اظہار سے ظاہر ہے کہ ولی میاں کو دین سے مکمل واقفیت نہیں تھی۔ لوگوں نے ولی میاں کے دونوں بیٹوں سے صاف کہہ دیا کہ ولی میاں کی اس آخری خواہش کو پورا نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ دین کے خلاف ہے۔ یوں تو قبرستان میں نئی قبریں پرانی قبروں کی جگہوں پر ہی بنتی ہیں لیکن اس وقت کہ جب کسی پرانی قبر کا کوئی نام ونشان نہ ہو— جانتے بوجھتے کسی قبر پر نئی قبر نہیں کھودی جا سکتی۔ مسجد کے مولوی صاحب آئے تو ان کی بھی یہی رائے تھی۔ انہوں نے تو لڑکوں کو یہ یاددہانی بھی کرائی کہ میاں بیوی میں سے کسی ایک کے بھی مرنے کے بعد ان میں میاں بیوی کا رشتہ رہتا ہی نہیں۔

دونوں بیٹوں میں چھوٹا بیٹا محسن تو باپ کی آخری خواہش پوری کرنے کو تیار نہ تھا کیونکہ قوم کی رائے کے خلاف وہ کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر گھر والوں نے زیادہ ضد کی تو بہت سے لوگ اٹھ کر چلے جائیں گے اور تجہیز و تکفین اور دفن میں حصہ بھی نہیں لیں گے۔ اور ایسا ہونے دینا وہ ٹھیک نہیں سمجھتا تھا۔ زندگی میں جو شخص ہر دل عزیز رہا ہو، اب آخری وقت میں لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں تو یہ اچھا نہ ہوگا۔ اس نے بڑے بھائی سے کہا۔

''بھائی جان، ابا کی یہ خواہش پوری نہیں کی جا سکتی۔ اگر ہم نے ضد کی تو لوگ ابا کا جنازہ چھوڑ کر اپنے اپنے گھر کی راہ لیں گے۔ کسی دوسرے کی قبر کھود کر اس پر نئی قبر بنایا جانا کوئی بھی پسند نہیں کرے گا، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو قبر پر قبر بنانے کی نئی روایت قائم ہو جائے گی جس سے قبروں کا تحفظ ختم ہو جائے گا، ایسا مولوی صاحب کہتے ہیں۔'' ''مگر محسن، ابا اپنی بیوی کی قبر میں اپنی قبر بنوانا چاہتے ہیں، کسی دیگر کی قبر میں تو نہیں۔ کیا ہم انکی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔ اور آخر اس میں برائی بھی کیا ہے۔ مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔''

''بھیا سمجھو ذرا، اماں کو مرے ہوئے صرف ایک سال ہوا ہے ان کی قبر کھودی گئی تو اس میں ان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آئے گا۔ اس ڈھانچے کو بھی دیکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔

کئی لوگ خوف زدہ ہو سکتے ہیں''

''ممکن ہے کہ اب ڈھانچا بھی موجود نہ رہا ہو۔؟''

''اور اگر موجود ہوا تو۔؟''

بڑا بھائی خاموش تو ہو گیا لیکن باپ کی آخری خواہش پوری نہ ہونے سے وہ بے چین بے چین سا رہا۔ وہ جذباتی تھا اور اس کی یہ سوچ یقیناً اس کے جذبات پر ہی مبنی تھی۔ وہ لوگوں کے درمیان خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی بے چینی دیکھ کر لوگ آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ محلے کے دینی معاملوں اور مسائل میں ہمیشہ آگے رہنے والے ڈرائیور اسمٰعیل میاں نے سبھی کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ انہوں نے کہا۔

''میری رائے یہ ہے کہ ولی میاں کی بیگم صاحبہ کی قبر نہ کھودی جا کر ان کے برابر والی خالی جگہ پر میاں کی قبر بنا دی جائے۔ کم سے کم دونوں قبریں پاس پاس تو ہو جائیں گی۔ موجودہ حالات میں یہی غنیمت ہے''۔

لوگوں نے اسمٰعیل میاں کی رائے سے اتفاق کیا اور ولی میاں کی قبر ان کی بیگم کی قبر کے پاس کی خالی جگہ پر کھودنے کی ہی رائے دی۔ چھوٹے بیٹے محسن کو یہ تجویز بہت معقول لگی اور اس نے بڑے بھائی سے مزید مشورہ کئے بغیر لوگوں سے ہاں کہہ دیا۔ بڑا بھائی احسن خاموش رہا۔ اسے پھر بھی افسوس تھا کہ ابا کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ اگر موت کے بعد بھی دونوں ایک ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اسے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ لوگ اماں کے تئیں ابا کے بیحد محبت کے جذبے کو سمجھ ہی نہ پائے۔ بیوی سے محبت کرنے کا ایک ثبوت شہنشاہ شاجہاں نے دیا تھا اور اپنی قسم کا دوسرا ثبوت اس کے ابا نے اپنی بیوی کی قبر میں ہی دفن ہونے کی خواہش ظاہر کر کے دیا تھا۔

ظہر کی نماز کے بعد جنازہ قبرستان لے جایا گیا۔ سینکڑوں غریب و امیر لوگوں نے شرکت کی۔ بے شمار لوگوں کو دیکھ کر بھی لگتا تھا کہ شہر سے کوئی بڑی ہستی اٹھ گئی ہے۔ بڑے بیٹے احسن نے دیکھا کہ باپ کی قبر ماں کی قبر سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر کھودی گئی

ہے۔میاں بیوی کی قبریں قریب تو تھیں لیکن باپ کی خواہش پوری نہ ہو سکی اس بات کا اسے اب بھی افسوس تھا۔لیکن باپ کی خواہش پوری کرنا صرف اس کے ہاتھ میں تو نہ تھا۔کسی مردے کو دفنانے کا کام خاندان والوں کا کام نہ رہ کر قوم کا کام ہو جاتا ہے۔یعنی جسم سے روح نکل جانے کے بعد ہی انسان اپنوں سے ناتا توڑ لیتا ہے۔

قبر تو پہلے سے ہی قبرستان کے پیشہ ور گورکنوں نے کھود کر رکھی تھی۔ولی میاں کو قبر میں اتار کر لوگوں کو آخری بار ان کا چہرہ دکھایا۔پھر ڈھانک دیا گیا۔اس کے بعد قبر کی ایک دیوار کی جانب پتھر کے پٹیے ترچھے ترچھے لگا کر ان پر مٹی کے گیلے گوندوں سے تین چٹائیاں چپکائیں، پھر لوگوں نے مٹی دی اور پھر گورکنوں نے پھاوڑوں سے اوپر رکھی ساری مٹی قبر میں ڈال دی۔پھر قبر کے اوپر بھی اتنی مٹی ڈالی کہ وہ اونچی ہو گئی۔پھر کتبہ لگا دیا گیا۔اور پھر آخر میں مولوی صاحب نے کتبے پر انگلی رکھ کر ایک آیت پڑھی۔پھر سبھی نے فاتحہ پڑھی۔ اور بس یہ سب کام آدھا گھنٹے کے اندر اندر ہو گئے۔اور پھر قبر کو چھوڑ کر سبھی لوگ قبرستان سے رخصت ہو لئے۔احسن دیر تک اپنے باپ کی قبر کے پاس بیٹھا رہنا چاہتا تھا مگر محسن نے چلنے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اسے اٹھنا ہی پڑا۔سبھی کے ساتھ وہ گھر آ تو گیا مگر اسے اب بھی اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ اپنے باپ کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا۔

گھر میں سبھی لوگ ولی میاں کے ہمیشہ کے لئے دنیا سے چلے جانے سے مغموم تھے۔وہ شام تک ان کے ساتھ رہا، پھر شام کو کار لے کر گھر سے نکل گیا۔کسی سے نہیں کہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

وہ قبرستان گیا اور وہاں دروازے پر بنے ایک کچے مکان میں رہنے والے عمر رسیدہ اور قبرستان کی دیکھ بھال کرنے والے گورکن رزاق کو بلایا۔رزاق نے باہر آتے ہی کہا ''صاحب، آپ فکر مت کرو، قبر کی حفاظت ٹھیک طرح کی جائے گی۔کوئی جانور قبر میں نہ گھسے اس لئے باہر چاروں طرف کچھ اور گیلی مٹی کے لوندے اور پٹیئے لگا کر اسے بالکل محفوظ کر دیا جائے گا۔''

احسن نے گورکن کو مزید کچھ سمجھایا تو گورکن رزّاق نے اپنی گردن ہلا کر ہاں میں ہاں کر دی۔پھر احسن کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

رات کے قریب دو بجے تھے۔سڑکیں سنسان تھیں اور دنیا کی ہر شے سوئی ہوئی لگتی تھی۔ایسے سناٹے میں احسن کی کار خاموشی سے چلتی ہوئی آئی اور قبرستان کے دروازے پر آکر رک گئی۔احسن کار میں سے اترا اور قبرستان کے اندر چلا گیا۔اس کے باپ کی قبر کے پاس چار گورکن ایک گیس بتی اور ہاتھوں میں گینتی، تگاڑی اور پھاوڑے لئے کھڑے تھے اور جیسے اس کی آمد کے انتظار میں ہی تھے۔

احسن کو دیکھ کر عمر رسیدہ گورکن رزّاق نے کہا'' آپ کی اجازت ہو تو کام شروع کر دیا جائے حضور ـــــ؟''

''ہاں شروع کر دو''

اس کا یہ کہنا تھا کہ چاروں گورکنوں نے اس کی اماں کی قبر کھودنا شروع کی۔آدھا گھنٹے سے قبل ہی قبر کی ساری مٹی بہت احتیاط سے نکال دی گئی۔سب کے ساتھ احسن نے بھی دیکھا کہ قبر میں مٹی لگا ہوا اس کی ماں کا ہڈیوں کا ڈھانچا رکھا ہوا تھا۔لیکن...... یہ دیکھ کر سبھی کو حیرت ہوئی کہ اماں کی قبر سے ابا کی قبر کا جو ایک فٹ کا فاصلہ تھا وہ خود بہ خود اندر سے ختم ہو گیا تھا، کیونکہ...... کیونکہ اس ایک فٹ کے فاصلے کی مٹی ماں کی قبر کھودنے سے قبل ہی ٹوٹ چکی تھی اور دو قبریں دو نہ رہ کر اندر سے ایک قبر ہو چکی تھی۔دن میں جب وہ قبرستان سے گیا تھا تو امی اور ابا کی دو قبریں دیکھ کر گیا تھا اور اب...... ایک قبر کھودنے سے پتہ چلا کہ امی اور ابا کی ''اندر سے'' اب ایک ہی قبر تھی۔دن میں نہ جانے کچھ یہ کیسے ہو گیا...... موسم بھی بارش کا نہ تھا...... کوئی معجزہ...... یا فرشتوں کی مدد...... خدا جانے......؟ وہ سوچنے لگا۔

''سرکار......'' گورکن رزاق نے کہا'' اب آپ کہیں تو آپکے والد صاحب کی قبر اوپر سے کھود کر والد صاحب کے جنازے کو آپکی والدہ صاحبہ کی قبر میں رکھ دیں۔؟''

احسن نے کچھ دیر سوچا۔پھر کہا''نہیں، اب ضرورت نہیں، کیونکہ وہ دونوں ایک ہو چکے ہیں۔دیکھتے نہیں کہ دو قبروں کی ایک قبر ہو گئی ہے۔''

☆☆

ناگ

گھر میں سے نکل کر گول اور سانولے چہرے اور تقریباً چالیس کی عمر والا دھن سنگھ گوجر دالان میں آکر کھڑا ہوا تو گھر کے سامنے کانٹوں کے جھاڑوں کی باگڑ والے باڑے میں اس کی اپنی مکئی کی لہلہاتی فصل اسے بہت اچھی لگی۔ سارے گاؤں میں اس کے باڑے کی مکا زوردار تھی۔ پودھے ایک دم بڑے بڑے اور چمکدار تھے اور ان میں جو بھٹے لگے تھے وہ بھی اب کھانے لائق ہو گئے تھے۔ رات کو ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی اور صبح سورج نکل آیا تھا اس لئے پورے کھیت کے بھیگے بھیگے پودھے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

اس نے دیکھا کہ اس کی پتنی رام کلی باڑے میں تھی اور بھٹوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔ اور جو بھٹا موٹا موٹا نظر آتا اسے توڑ لیتی اور توڑ کر نائلون کے جھولے میں رکھنے لگتی تھی۔ پاس کے گاؤں میں اپنے چاچا کے گھر بھیجنے کے لئے شاید وہ زیادہ بھٹے توڑ رہی تھی۔ وہ اپنے چاچا کو اپنے مرحوم باپ کی طرح چاہتی تھی۔ چاچا نے اس سال مکا نہیں بوئی تھی۔

کچھ دیر کھڑا وہ یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ رام کلی بھٹے توڑتی ہوئی باگڑ کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ اس سمت میں آگے بڑھ رہی تھی کہ جہاں ببول کا درخت ہے۔ معاً اسے کچھ یاد آیا۔ اور یاد آتے ہی اس کے بدن میں خوف سرایت کر گیا۔ اگر چہ ببول کا درخت کچھ دور تھا لیکن رام کلی کے وہاں پہنچنے میں بس پانچ منٹ کی ہی دیر تھی۔ اب تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ رام کلی کی جان جا سکتی تھی۔

اس کے باڑے (چھوٹے کھیت) سے لگے ہوئے باڑے کے پڑوسی رام پرشاد مینا نے اسے گذری ہوئی شام کو ہی بتایا تھا۔

''تھارے باڑے میں میں نے گجراج دیکھا ہے۔''

''گجراج مطلب۔؟''

''مطلب کہ ناگ...... پانچ چھ فٹ کا کالا سانپ...... میں نے اُتے باگڑ کے پاس جہاں گمار پاٹھا لگیو ہے بھاں ایک بل کے اندر گھستے کل سانجے دیکھیو ہے...... بڑا جنگی ہے...... وہ ناگ ہی ہے...... تھوڑا دھیان رکھیو...... اور سپیرے سے پکڑائے بنا باڑے میں مت گھسیو......''

رام پرشاد مینا کے مکّا کے باڑے میں چونکہ ڈیرا (مکّا کے چھوٹے کھیت میں چار موٹی لکڑیوں پر، قریب دو میٹر کی اونچائی پر بنائی گئی چھوٹی سی جھونپڑی جہاں سے طوطے اور دیگر پرندوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور انہیں ہاش ہوش کر کے یا ہتھیلیاں بجا کر پودھوں پر سے اڑایا جاتا ہے) دھن سنگھ کے مکّا کے باڑے کے بہت نزدیک تھا، اس لئے رام پرشاد نے وہاں سے ناگ کو دیکھ لیا تھا اور دھن سنگھ کو خطرے سے آگاہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن اس سے بات چیت کے بعد دھن سنگھ ایسا مصروف ہوا اور رات میں جلد ہی نیند نے آگھیرا تو وہ بات رام کلی کو بتانا ہی بھول گیا تھا۔

اور اب......... رام کلی سیدھے اس ناگ کے منہ میں جا رہی تھی۔ اب سے ایک گھنٹہ قبل سورج نکل آیا تھا اس لئے وہ ناگ یا تو ببول کے پیڑ کے نیچے اپنے بل کے آس پاس ہوگا یا باڑے میں گھوم پھر کر کیڑے مکوڑے تلاش کر رہا ہوگا۔ اور جو رام کلی کا پیر اس پر پڑ گیا تو...... ارے رام...... بڑی گبد (مصیبت) ہو جائے گی۔

اس نے سانپ کے بارے میں آگاہ کرنے اور رام کلی کو واپس لوٹ آنے کی ہدایت کرنے کے لئے زور سے چلّانا چاہا...... مگر...... کڑکتی بجلی کی تیزی سے اس کے دماغ نے کچھ اور کہا، اور وہ چلّاتے چلّاتے رک گیا۔

اس کے دماغ نے کہا۔ کیا کرتا ہے اُلّو...... پانچ برسوں سے رام کلی اپنے کھراب سبھاؤ کے کارن تیری اور تیری ماں کی بے عزتی کرتی آرہی ہے وہ تیرا کہا نہ مان کر ہر کبھی پاگلوں کھائیں چیخنے چلّانے لگت ہے۔

تُو اس کی مار پیٹ کرت ہے پھر بھی نہیں مانت ہے۔ کبھی کبھی وہ تجھے گالیاں بھی

دیت ہے اور تجھ سے جھوم بھی جات ہے......اور گصے میں اس نے تھارے کپڑے بھی پھاڑے تھے......اور دوبار تو اس نے تھارے ہاتھ پہ کاٹا بھی تھا......اور لڑائی کرت کوت اس نے دوگاؤں والیوں کو بھی ان کے بازو پہ کاٹا تھا......وہ کٹکھنی ہے......تو اس سے بڑھمیس پریسان رہا......اس نے تھاری ناک میں دم کر رکھیو ہے......اس نے کدی تھارو بھلا نئیں چاہا۔ تھارو براہی برا کیا......وہ تھاری دُشمن ہے دُشمن......اس سے چھٹکارہ پانے کو گلا دبا کے تینے اس کو مار ڈالنا چاہا......اور ایک بار ندی کی گہرائی میں تینے اس کو دھکہ دینا چاہا مگر تو ڈرپورک کچھ بھی نہ کر سکا......کیونکہ تو نے کانون اپنے ہاتھ میں کدی نئیں لیا......لیکن اب یہ سنہری موکا کھد چل کے آیو ہے۔اور ایسا لگت ہے کہ کٹکھنی کے کھراب کرموں کا ڈنڈ دینے ہی یہ ناگ تھارے باڑے میں آیو ہے......وہ اس بخت (وقت) جرور مگا کے باڑے میں کیئں نہ کیئں چل پھر ریا ہوگا......اور اگر رام کلی کا پیر اس پر پڑ گیا تو کیا وہ اسے ڈسنے سے چوکے گا ......ایک سمجھدار پتی تو اپنی پتنی کی کھراب حرکتوں کو ماف کرت رہے لیکن سانپ تو سانپ ہے، وہ نیئں چھوڑے ہے۔ایک بار بھی کسی کے چھیڑ دیئے جانے پر وہ جرا میں آگ بگولہ ہو جات ہے اور اپنے اوپر کسی کا ایک پیر بھی پڑ جانا اسے برداست نیئں ہوت ہے۔اور وہ کصوربار (قصوروار) کو ڈنڈ دیئے بنا نیئں رہت ہے اور اسے ڈس کے چھوڑے ہے......

دھن سنگھ کا خیال تھا کہ رام کلی کے کرم ایسے خراب تھے کہ وہ جان سے مار ڈالنے لائق تھی۔مگر کبھی قانون کے ڈر سے اور کبھی اپنے ہاتھوں ہتیا ہو جانے کے گناہ سے بچنے کے لئے اس نے کبھی رام کلی کو، تھوڑا مارنے پیٹنے کے علاوہ کبھی کوئی بڑی سزا نہیں دی تھی۔کئی دیہاتوں میں اس جیسی خراب اور جھگڑالو عورتوں کی ان کے آدمیوں نے ناک بھی کاٹ دی تھی مگر اس نے تو بہت غصّے میں بھی رام کلی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔اس کے اندر کے اچھے آدمی نے رام کلی کے ساتھ کچھ بھی خراب نہیں کرنے دیا تھا۔مگر آج تو موقع خود چل کے آیا ہے۔اگر آج رام کلی کا پاؤں سانپ پر پڑ گیا تو وہ سانپ اسے چھوڑے گا نہیں۔اور اسے اپنے خراب کرموں کی سزا ملے گی۔

تو پھر وہ کیا کرے۔؟ کیا خاموش رہ کر تماشہ دیکھتا رہے۔؟

اس کے دماغ میں خیالات آسمان کی بار بار کڑکتی بجلی جیسی تیزی کے ساتھ آرہے

تھے۔ باڑے میں چلتے پھرتے ناگ نے آج اگر رام کلی کو ڈس لیا تو وہ تڑپ تڑپ کر تھوڑی ہی دیر میں مرجائے گی۔ اور اسے خراب پتنی کے خراب برتاؤ سے نجات مل جائے گی۔ گھر کے ہنگامے بند ہو جائیں گے اور گھر میں شانتی قائم ہو جائے گی۔ اس کی ایک ہی بیٹی ہے جس کا بیاہ بھی ہو چکا ہے۔ بنا پتنی کے وہ اکیلا تو ہو جائے گا مگر کتنے دن؟ وہ مانگی لال گوجر کی چوبیس پچیس سال کی عمر کی بیٹی سسرال چھوڑ کے دو سال سے گھر میں بیٹھی ہے۔ وہ کھوبصورت ہے اور اچھے سبھاؤ کی ہے اور مسکرا کے بات کرت ہے اور رام کلی کی بھائیں (طرح) کبھی کسی سے گُصہ نہیں کرت ہے۔ وہ اس سے بیاہ کر لے گا تو اس کا جیون سدھر جائیگا۔

وہ اتنا کٹھور دل نہیں ہے کہ اپنی ہی عورت کے مرجانے کا یا خود مار ڈالنے کا سوچتا مگر ہمیس گھر میں لڑائی جھگڑا کرنے والی، گھر کی شانتی برباد کرنے والی اور دوسروں کی عجت کھراب کرنے والی عورت تو جینے لاک ہوتی ہی نہیں، اس لئے اس بار اسے اپنا دل کڑا کر لینا چاہئے...... اور اگر وہ مرتی ہو تو مرجائے۔ اب تو ناگ راج جانے اور وہ...... وہ بھی کٹکھنی ہے اور ناگ بھی کٹکھنا ہے۔ اب تو کٹکھنا ہی کٹکھنی سے نپٹے گا۔

اسے ناگ سے نہ بچانے کا اس کا فیصلہ آخری تھا۔ رام کلی کے معاملے میں اس نے اپنا دل سخت کر لیا تھا۔

قریب دو سو قدم دور دائیں جانب، پیپل کے درخت کے پاس ایک کنواں تھا جس میں سے گاؤں والیاں پینے کا پانی بھرتی تھیں۔ وہاں ایک جانب کپڑے دھونے کے لئے کچھ پتھر کے پٹیے بھی جمے ہوئے تھے۔ ان پتھروں پر دو گاؤں والے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ دھن سنگھ ان کے پاس چلا گیا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بظاہر تو وہ ان لوگوں سے باتیں کر رہا تھا مگر نظریں اس کی رام کلی کی نقل و حرکت پر ہی تھیں۔ قریب پانچ چھ منٹ گذر گئے۔ اور پھر رام کلی ببول کے درخت کے پاس سے واپس لوٹنے لگی۔ کچھ مستی کے موڈ میں تھی کیونکہ واپس آتے آتے وہ اُچک اُچک کر چل رہی تھی اور مکا کے پودھوں پر ہاتھ مارتی جا رہی تھی۔ اور خطرے میں تو وہ اب بھی تھی۔ نہ جانے کہاں اور کب وہ سانپ اس کے پیروں میں آجائے اور......

اور پھر ہوا یہ کہ وہ باڑے کی پھٹکی تک آگئی اور بخیر و عافیت باڑے سے باہر نکل آئی۔

''بچ گئی سالی'' اس نے سوچا ''لیکن کب تک بچے گی۔ سانجھ یا سکارے (شام کو یا صبح) پھر باڑے میں جائے گی۔ کبھی نہ کبھی تو......؟

اس نے دیکھا کہ رام کلی باڑے سے باہر نکلی تو پڑوس کے رام پرشاد کی پتنی گجری بائی سے اس کا سامنا ہو گیا۔ اور دونوں باتیں کرنے لگیں۔ لیکن جلد ہی بھٹوں سے بھرا جھولا ہاتھ میں لئے رام کلی آگے بڑھ گئی اور اپنے گھر کی جانب جانے لگی۔

وہ اٹھا اور باڑے کی پھٹکی تک پہنچا، کیونکہ گجری بائی سے بات چیت کے دوران وہ بھول سے پھٹکی کھلی چھوڑ گئی تھی۔ اور پھٹکی کھلی ہو تو کوئی بھی جانور باڑے میں گھس سکتا ہے اور مکا کے پودھوں کو صفایا کر سکتا ہے۔

رام کلی اس وقت گھر کے دالان تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن جانے کیسے اس کی نظر دھن سنگھ پر پڑ گئی۔ وہ پلٹی اور زور سے چلائی ''اے تنک رکو...... کاں جارئے ہو۔؟''

وہ دوڑ کر اس کے پاس آ گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بہت گھبرائی گھبرائی سی بولی

''اے رک جاؤ، اندر باڑے میں مت جیئو''

''کا بات ہے۔؟''

''اندر باڑے میں سانپ ہے...... مجھے ابھی گجری بائی نے بتایو ہے...... میں تو بال بال بچ گئی...... اے رام...... میں اگر پلٹ کے تمے دیکھ نیئں لیتی اور تم اندر چلے جاتے اور تمے کچھ ہو جاتا تو......؟''

وہ رام کلی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔!!

رمیّا اور ایڈس

''اے بائی...... کچھ سنا تم نے؟'' ایک پڑوسن نے دوسری پڑوسن سے کہا۔

''نہیں تو...... کالونی میں کچھ ہوا کیا؟''

''رمیّا کو ایڈس ہو گیا ہے''

''کیا......؟ رمیا کو ایڈس......؟ سچ بولتی ہو تم......؟

''بالکل سچ، وہ اسپتال میں پڑی ہے۔ اپنا چِنکی ابھی وہیں سے آیا ہے''

''رنڈی کہیں کی...... اس کے لچھن ہی ایسے تھے...... کبھی اس سے آنکھ مٹوا...... تو کبھی اس سے آنکھ مٹوا...... اسے ایڈس نہ ہوتا تو کیا ہوتا......''

جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پوری آزادنگر کالونی میں پھیل گئی کہ رمیا کو ایڈس ہو گیا ہے اور وہ تالاب کنارے والے سرکاری اسپتال میں داخل ہے۔ اس خبر میں حقیقت یہ تھی کہ رمیا کا خون H.I.V. (Positive) پایا گیا تھا۔ لیکن ان باریکیوں کو کون سمجھتا کہ جسم میں خون ایچ آئی وی Positive ہونے کے کافی عرصے بعد ایڈس ہوتا ہے۔ لیکن ایسے خون کی رپورٹ آنے سے ہی لوگ مان لیتے ہیں کہ ایڈس ہو گیا۔

رمیا کو ایڈس ہو جانے کی خبر سے پوری کالونی میں یہاں سے وہاں تک خوف پھیل گیا۔ کالونی میں رہنے والے ہر انسان کو یہ محسوس ہوا کہ جیسے کوئی جنگلی خونخوار جانور کالونی میں گھس آیا ہے اور جواب کسی بھی لمحہ ان پر حملہ کر سکتا ہے۔ ایڈس اتنے قریب آیا تو لگا کہ جیسے موت قریب آ گئی ہے۔ ایڈس کا نام ہی ایسا خوفناک ہے جس کا لفظ کان میں پڑتے ہی موت کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ ایڈس کا مہلک اثر دیکھئے کہ پہلے انسان کی خوبصورتی

کو بدصورتی میں اور پھر اس کی زندگی کو موت میں تبدیل کر کے ہی دم لیتا ہے۔

کالونی میں رمیا کی پہچان ہر ایک سے تھی۔ وہ باتونی اور ملنسار تھی۔ محلے میں خوشی اور غم ہر موقع پر تو وہ ہر ایک کے یہاں جاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ کالونی کے کچھ لوگ، خصوصاً خواتین اس کے یہاں بھی جاتے تھے اور اس سے مل کر خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ ایک دولت مند تاجر کی جوان، تعلیم یافتہ اور فیشن زدہ بیوی تھی اور بیشتر موضوعات پر خاصی بحث کر لیتی تھی۔ خوبصورت تو وہ زیادہ نہ تھی مگر اس کی شخصیت میں کشش تھی اور جوانی اس کے گورے بدن سے مشتہر تھی۔ وہ عموماً اسکرٹ ٹاپ پہنتی تھی، آنکھوں پر ڈارک گلاس کا چشمہ لگاتی تھی اور آدھے تراشے ہوئے بال اس کے سر اور چہرے پر جھولتے ہوئے اس کی شخصیت میں اضافہ کرتے تھے اور پھر میک اپ وغیرہ سے بھی وہ اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھتی تھی۔ لیکن جب اس کے ایڈس میں مبتلا ہو جانے کی خبر آئی تو کالونی کا ایک بھی بندہ اس کی ڈھارس بندھانے یا اسے دیکھنے نہیں گیا۔

ہوا یہ تھا کہ شہر میں وائرل بخار پھیل رہا تھا۔ رمیا کو بخار ہوا تو عادت کے مطابق علاج کرانے وہ میڈیکل کالج سے ملحق سرکاری ہسپتال ہی گئی کہ جہاں میڈیکل کالج کے قابل پروفیسر لوگ او پی ڈی میں باہر کے مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ تین روز تک بخار نہ اترا تو اسے ڈاکٹر نے ہسپتال میں داخل کر لیا اور فوراً ہی اس کے خون کی کئی جانچیں کرائیں۔ جانچ رپورٹ آئی تو ڈاکٹر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا خون ایچ آئی وی پوزیٹو تھا یعنی رمیا کے اندر ایڈس کی شروعات ہو چکی تھی۔ رپورٹ دیکھتے ہی ڈاکٹر نے رمیا کو جنرل وارڈ سے ایک پرائیویٹ کمرے میں بھیج دیا اور جب رمیا کو اس بابت بتایا گیا تو وہ بہت روئی تھی اور روتے روتے بولی تھی ''یہ کیا ہو گیا رام جی...... میں تو بھری جوانی میں چلی...... میں بچ گئی تو اب کوئی گناہ نہیں کروں گی...... میں توبہ کرتی ہوں رام جی...... توبہ کرتی ہوں......''

اس وقت اس کا شوہر شہر سے باہر تھا، بس پڑوس کا پندرہ سولہ سال کی عمر کا ایک لڑکا ہی تھا جس نے خون کی رپورٹ میں ایچ آئی وی کی موجودگی جان کر پہلے تو اسے تسلی دی لیکن پھر خود ڈر کے مارے چپ چاپ رمیا کے پاس سے بھاگ نکلا اور گھر جا کر اپنی ماں کو رمیا کی بیماری سے باخبر کیا۔ اور پھر تو یہ خبر ایک گھنٹے کے اندر اندر کالونی کے سبھی لوگوں تک

پہنچ گئی۔ H.I.V.(Positive) کی باریکیوں کو کون سمجھتا ہے۔ جسم میں خون ایچ آئی وی پوزیٹو ہونے کے برسوں بعد ایڈس ہوتا ہے لیکن H.I.V.(Positive) خون کی رپورٹ آنے سے ہی لوگ مان لیتے ہیں کہ ایڈس ہو گیا۔

رمیّا کو ایڈس ہو جانے کی خبر نے کالونی کی عورتوں میں گھبراہٹ پیدا کر دی تھی۔ انھیں یہ فکر ستانے لگی کہ کالونی کے نہ جانے کون کون مرد لوگ رمیّا کے رابطے میں آئے ہوں گے اور جو جو بھی آئے ہوں گے تو وہ بھی اب بچنے والے نہیں۔ رمیّا کی طرح ان سب کے بھی موت کے وارنٹ کٹ جائیں گے۔ وہ بھی اسپتال جائیں گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے۔ انہوں نے یہ سب اس لئے سوچا کیونکہ کیریکٹر کے معاملے میں رمیّا کالونی میں شک کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔

لیکن......اب جاننے والی بات یہ ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جو رمیّا کے رابطے میں آئے ہوں گے اور یہ کہ کالونی میں اب کس کس کے گھر بجلی گرنے والی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ رمیّا کے رابطے میں کالونی کے کچھ مرد آئے ضرور ہوں گے۔ رمیّا نے دو چار کو یا ممکن ہے اور بھی زیادہ مردوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوگا۔ کالونی کے مردوں سے وہ بے شرم کس طرح بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایسی عورتیں بظاہر تو اچھی بنی رہتی ہیں لیکن اندر اندر گل کھلانے سے باز نہیں آتیں............اور پھر ہوا یہ کہ اسی دن دوپہر میں کالونی کے قریب قریب سبھی جوان اور ادھیڑ شادی شدہ مردوں کی بیویوں نے اپنے شوہروں سے رازداری میں پوچھا کہ کہیں انہوں نے رمیّا سے جسمانی تعلق تو قائم نہیں کیا۔ لیکن سبھی نے اس بات سے انکار کیا۔

بیویوں کے سامنے سبھی مردوں نے انکار تو کر دیا تھا لیکن کالونی کے دو جوان اور دو ادھیڑ عمر کے مرد رمیّا کی ایڈس کی بیماری کی خبر سن کر کانپ اٹھے تھے۔ وجہ آپ سمجھ ہی گئے ہوں کہ انہوں نے رمیّا سے نزدیک کا تعلق قائم کیا تھا۔ کچھ [illegible] یب کا کہ جس سے ایڈس کے جراثیم ان کے خون میں داخل ہو گئے ہوں۔ کیونکہ ایڈس ہو جانے کے ممکنات کے خوف سے وہ وہ اندر اندر کانپنے لگے تھے، اگرچہ اپنے چہروں سے تو اب بھی وہ نارمل بنے رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امید کی بس ایک کرن انہیں نظر آ رہی تھی کہ رمیّا کا قرب حاصل

کرنے کے باوجود ممکن ہے کہ ان کے اندر ایڈس کے جراثیم داخل نہ ہوئے ہوں، کیونکہ رمیّا سے ان کا تعلق پانچ سات ماہ قبل کا تھا اور رمیّا کی بیماری ابھی ابھی ظاہر ہوئی تھی۔

وہ چار لوگ تھے۔ دیپک ٹھیکیدار، شراب کی دکان چلانے والا شنکر لال سندھی، گریش وکیل اور بوٹیک چلانے والی مسز ماریا کا شوہر سولومن جو خود تو کوئی کام کرتا نہ تھا لیکن بیوی کی کمائی پر عیش کرتا تھا۔

ان چاروں لوگوں نے رمیّا کے ایڈس میں مبتلا ہونے کی خبر سنی تو دوپہر میں ہی انہوں نے آپس میں رابطہ قائم کیا اور دکھی دکھی سے دیپک کے گھر میں صلاح مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ ان قیدیوں کی طرح کہ جن کو موت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔ وہ سبھی عاشق مزاج تھے جو اپنی بیویوں سے بے وفائی کر کے ادھر ادھر کے شکار کی تلاش میں رہتے تھے لیکن اپنی اسی عادت کے باعث اب مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ انھیں گھبراہٹ اس بات کی تھی کہ اب عزت بھی جائے گی اور بیویاں کو سینگی وہ الگ...... گھر کی اور بچوں کی بدنامی بھی ہوگی۔ ان کے جسم میں ایڈس پایا گیا تو سماج میں وہ نفرت کی نظر سے دیکھے جائیں گے اور...... سماج کے لوگ ان سے تعلق قطع کر لیں گے اور بالآخر جان سے بھی جائیں گے۔ بڑا خراب انجام ہوگا ان کی زندگی کا۔ کاش کہ انہوں نے رمیّا جیسی بدکردار عورت سے دوستی ہی نہ کی ہوتی اور اچھا تو یہی ہوتا کہ وہ خود اپنے گھر کی عورت کو چھوڑ کر کسی دیگر عورت پر نظر ہی نہ ڈالتے۔

رمیّا اپنے کالج کے دنوں میں بھی دو تین بوائے فرینڈس بنا کر رکھتی تھی یعنی شروع سے ہی وہ عاشق مزاج تھی۔ اور جب پانچ سال قبل اس کالونی کے ادھیڑ عمر تاجر سوہن لال مکھیجہ سے اس کی شادی ہوئی تو اپنے شوہر کو ہر وقت تجارت میں مصروف دیکھا اور مہینے میں کئی بار اسے دیگر شہروں کو بزنس ٹور پر جاتے دیکھا اور اپنی تنہائی کے باعث اپنے جوان ارمانوں کا گلا گھٹتے دیکھا تو مردوں کو دوست بنانے والی اس کی رگ پھڑ پھڑائی اور تنہائی اور بوریت دور کرنے کے ارادے سے وہ کالونی میں ہی مرد دوست بنانے لگی۔ ایسے لوگوں کو جو اسی کی طرح آزاد خیال اور عاشق مزاج تھے۔

رمیّا کس قسم کی عورت ہے یہ جاننے میں کالونی والوں کو دیر نہ لگی تھی، لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا اور پہلے جیسا نہیں رہا تھا، اس لئے اس پر انگلی کسی نے بھی نہیں اٹھائی۔ وہ

کس کس کے ساتھ رہتی ہے اور شراب کیوں پیتی ہے اس بات کی فکر بھی کسی کو نہیں ہوئی۔ ایسی منہ پھٹ اور دولت مند عورتوں پر انگلی اٹھانے کی جھنجھٹ کون مول لے اور جھنجھٹ مول لینے کی فرصت بھی آج کل کسے ہے۔ پھر رمیا بھی کچھ ایسی تھی کہ اسے بھی سماج کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بندا س مشہور تھی۔

رمیا کی اس خوفناک بیماری سے کالونی کی شادی شدہ عورتیں بے حد فکر مند ہوگئی تھیں۔ اگر چہ کالونی کے سبھی جوان اور ادھیڑ عمر کے مردوں نے اپنی اپنی بیویوں کے سامنے قسمیں کھا کر رمیا سے کوئی جسمانی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا تھا لیکن بیویوں کو ان کے جواب پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ نہ صرف ہر مرد سے بے تکلف ہو کر اور مسکرا کر بات کرتی تھی بلکہ جلد ہی اپنی دلکش باتوں سے ان کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ اس کا کردار مشکوک ہونے کے باعث کالونی میں وہ ایک آوارہ عورت سمجھی جاتی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ ہر روز رات میں شراب کے نشے میں رہتی ہے۔

اس دن سہ پہر کے وقت کالونی کی عورتیں مسز دیال کے گھر میں جمع ہوئیں اور رمیا کو برا بھلا کہہ کر اپنی فکر کا اظہار کرنے لگیں ''میں تو پہلے ہی کہتی تھی بہن جی'' مسز ورما بولیں '' کہ اس کل موہی کو کالونی سے نکالو مگر میری بات کسی نے نہیں سنی، اب تو ثابت ہو گیا نا کہ وہ کیا ہے''۔

''وہ کیا ہے، یہ بتا کر سمے برباد مت کرو جی، اب تو یہ دیکھو کہ رمیا نے اپنی کالونی کے کتنے مردوں کو خراب کیا ہے۔ اگر سمے رہتے یہ پتہ نہ چلا تو کئی گھر برباد ہو جائیں گے'' مسز سارنگ بولیں، جو ایڈوکیٹ سارنگ کی سماجی کارکن بیوی تھی۔

''ارے بھئی، مسئلہ تو سیدھا سیدھا یہ ہے'' انجینئر کمال احمد صدیقی کی بیوی غزالہ صدیقی بولیں '' کہ ہمیں یہ پتہ نہیں کہ ہمارے مردوں میں سے نہ جانے کن کن کے قریبی تعلقات رمیا سے رہے ہیں، وہ بتاتے نہیں ہیں اور اب جب تک وہ بتائیں گے نہیں تو ان کا بلڈ ٹیسٹ نہیں ہوگا اور بلڈ ٹیسٹ نہیں ہوگا تو اس بات کا علم کیسے ہوگا کہ ایڈس ہمارے کن کن گھروں میں پل رہا ہے...... خدا خیر کرے......''

''تو کیا کریں ہم؟'' مسز رائے زادہ نے پوچھا '' وہ تو اپنا منہ کھولتے ہی نہیں ہیں''۔

''کھولیں گے، ضرور کھولیں گے'' پولس انسپکٹر تیاگی کی فربہ جسامت والی بیوی نے اپنی تیوری پر بل ڈال کر کہا ''ان سے سختی سے پیش آیئے، ڈرایئے دھمکایئے، غصہ دلایئے، وہ منہ کھول ہی دیں گے۔ کیونکہ جب اچھے اچھے مجرم منھ کھول دیتے ہیں تو پھر یہ لوگ کس کھیت کی مولی ہیں''۔

''اور منھ کھول دیں تو پھر ان کے خون کی فوراً جانچ کرایئے'' شالنی جے سنگھ نے کہا ''اور اس طرح اپنے گھروں کو برباد ہونے سے بچاؤ بہنو، ایک بار یہ روگ ہماری کالونی میں پھیل گیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا، کیونکہ ہمارے لڑکوں میں بھی تو عقل نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے'' گریش وکیل کی بیوی بولی ''ہمیں ان سے اپنی اور اپنے بچوں کی قسمیں کھلوا کر سچ اگلوانا ہی ہوگا، وہ ضرور بولیں گے۔''

یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوئی اور میٹنگ برخاست ہوئی۔ اور پھر ہوا یہ کہ اگلی صبح ہی ان لوگوں کے نام سامنے آ گئے جنہوں نے رمیّا سے جسمانی تعلق قائم کئے تھے۔ دیپک ٹھیکیدار، شراب کی دکان چلانے والا شنکر سندھی، گریش وکیل اور بوٹیک چلانے والی مسز ماریا کا شوہر سولومن۔ ان سبھی کے خون کی جانچ کرائی گئی، لیکن ان میں سے کسی کا بھی خون H.I.(Positive) نہیں تھا...... حیرت......؟

کچھ لوگوں نے فوراً ہسپتال کے ڈاکٹروں کو اس حقیقت سے آگاہ کرایا تو انہوں نے تابڑتوڑ رمیّا کے خون کی تین جانچیں کرائیں۔ بے حد حیرت کی بات کہ رمیّا کا خون اس بار H.I.(Positive) نہیں پایا گیا۔

تو کیا واقعی رمیّا کا خون پاک صاف تھا؟ ڈاکٹروں نے اس بارے میں جواب دیا کہ رمیّا کے پہلے والے بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ دینے میں ہسپتال کی پیتھولوجی لیب سے غلطی ہوئی تھی۔ رمیّا کی رپورٹ کسی دیگر کے خون کی تھی اور ہسپتال والے عدیم الفرصتی کے باعث ایک رپورٹ پر ہی بھروسہ کئے بیٹھے تھے۔ سبھی نے کہا کہ سرکاری اسپتالوں میں اس طرح کی غلطیاں اور لاپرواہیاں ہونا کوئی نئی بات نہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ عموماً پرائیویٹ جانچیں کرانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ H.I.V.(Positive) خون والا وہ دیگر کون تھا؟ یہ جاننا اب ممکن نہ تھا۔ وہ جو کوئی بھی ہے سماج میں اس وقت آزادی سے گھوم

پھر رہا ہے۔ نہ جانے کتنوں کو وہ آدمی (یا عورت) ایڈس لگا دے گا۔

دوپہر کے بعد کی اس نئی اطلاع سے کالونی ہی نہیں سارا شہر پریشان ہو گیا اور شام کے ایک اخبار نے اپنے اداریہ میں سرکاری ہسپتالوں کی غیر ذمہ دارانہ کارکردگی کی خوب تنقید کی۔

رمیا کے ہسپتال سے ڈسچارج ہونے سے قبل ہی کالونی کی خواتین نے رمیا تک یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ کالونی میں قدم نہ رکھے، لہٰذا وہ کالونی میں آنے کے بجائے کہیں اور چلی گئی۔ کالونی کے ان چار لوگوں کی بڑی درگت ہوئی جنہوں نے ایڈس سے بے حد خوفزدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیویوں کے سامنے رمیا سے اپنے جسمانی تعلق قبول کر لیا تھا۔ وہ سوچنے لگے کہ انہوں نے رمیا سے جسمانی تعلق رکھ کر غلط کیا یا بیویوں کے سامنے منھ کھول کر غلط کیا۔ شاید غلط سبھی کچھ تھا۔ اگر رمیا کو سچ مچ ایڈس ہوتا تو......؟

ان چاروں لوگوں میں سے تین کو ان کی بیویوں نے معاف کر دیا۔ لیکن ایک نے اپنے شوہر کو گھر سے نکال کر اس کے خلاف عدالت میں طلاق کا دعویٰ لگا دیا۔ وہ شوہر تھا شرابی سولومن، جو بیوی کی کمائی پر عیش کرتا تھا اور خود کوئی کام نہ کرتا تھا۔

ایک ہاتھ اور ایک پاؤں

کوئی دو ماہ سے وہ پتھروں کے جنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ پتھریلی عمارتوں کا جنگل جسے شہر کہا جاتا ہے۔ عمارتوں کے اس جنگل سے نکل بھاگنے کی اسے کوئی راہ نظر نہیں آئی۔ اپنے درختوں کے جنگل، کھیتوں کی پرسکون فضا اور ندیوں کے سہانے مناظر کو اب وہ صرف تصوّر میں ہی دیکھ سکتا ہے۔ بار بار تصوّر میں اپنے گاؤں کو دیکھنا اسے دن کے خواب جیسا لگتا ہے۔ لیکن اس طرح کے دن کے خوابوں کے ذریعہ ہی اس کی گاڑی چل رہی ہے۔ ان کے سہارے ہی وہ شہر کے ناپسندیدہ ماحول میں بے کیف دل کے ساتھ جینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ورنہ ماہیٔ بے آب کی طرح وہ کب کا جان چھوڑ دیتا۔

شہر اسے پہلے بھی پسند نہیں تھے۔ بچپن میں جب کبھی وہ اپنے والدین کے ساتھ شہر آ کر ایک دن سے زیادہ ٹھہر جاتا تھا تو اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور اب تو شہر کی حالت ہی کچھ عجیب ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کی اور گاڑیوں کی دوڑ بھاگ دیکھ کر اسے جانوروں کے وہ ریوڑ یاد آ جاتے تھے جن کو گاؤں میں جب کبھی ڈنڈوں سے مار کر ہانکا جاتا تھا تو وہ سب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے بے تحاشہ بھاگتے تھے۔ یا پھر سڑکوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے شہر میں کوئی مصیبت آ گئی ہو اور سب لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ رہے ہوں۔ جنگل اور کھیتوں جیسا سکون تو اسے شہر میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہاں کی ہوا کیسی خراب ہے۔ ایک دم متعفن ایسی فضا میں شہر والے نہ جانے کیسے سانس لیتے ہیں۔ وہ سوچتا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ برسوں سے زندہ بھی ہیں۔ اور خوش بھی ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی قہقہے بھی لگاتے ہیں اور شہر کا پانی......؟ پانی کہاں کا اچھا ہے۔ نہ تو پیا جاتا ہے اور نہ حلق سے نیچے اتارا جاتا ہے۔ اور کھانا......؟ کچھ بھی کھا لو، ذائقہ ہی نہیں۔ یہاں تو گوشت بھی مزہ نہیں دیتا،

جب کہ گاؤں میں تو دال کھالو، آلو کھالو، انڈے کھالو، چٹنی کا سالن کھالو، سب مزہ دیتے ہیں اور پھر انسان......؟ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ جیسے کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ ان میں گاؤں کے لوگوں جیسا بھولپن ہی نہیں۔ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو جیسے دشمنوں سے بات کر رہے ہیں۔ ہنستے ہیں تو جیسے کوئی مشین ہنس رہی ہے۔ سب کچھ مصنوعی۔ اصل کچھ بھی نہیں۔ نہ پانی، نہ ہوا، نہ کھانا اور نہ ہنسی۔ اے اللہ، وہ کہاں آکر پھنس گیا ہے۔ گاؤں میں اب اس کے لئے مصیبت اور یہاں شہر میں بے چینی۔

اگر گاؤں میں وہ مصیبت نہ آجاتی تو وہ اپنی آزاد اور قدرتی فضاؤں کو چھوڑ کر اور اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر یہاں کیوں آتا اور کیوں روزانہ اپنا دل مسوستا۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے۔ دیہات کی فضاؤں کو تو جانے دو، لیکن حسنیٰ اس سے چھوٹ گئی تو یہ سچ مچ ہی اس کی بدبختی ہے۔ کسی کا پیار ساتھ چھوڑ دے یا کسی وجہ سے محبوب جدا ہو جائے تو پھر سمجھو کہ برے دن آگئے۔ اس کے برے دن سچ مچ آگئے تھے۔ گاؤں چھوٹا، محبوب جدا ہوا اور پلے پڑے شہر کے یہ بے گانہ قسم کے لوگ اور میدانِ جنگ کا سا منظر پیش کرنے والی اور کسی نہ کسی طرح ہر پل دل دھڑکانے والی یہ سڑکیں۔ جیسے تیسے اس نے یہ دو ماہ کا وقت شہر کی سڑکوں پر کسی طرح گذارا ہے۔

اب بہت یاد آتی ہے حُسنیٰ۔ وہ اس کی دلربا ہے۔ اور اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ شربتی گیہوں کے رنگ کا اس کا گول گول چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، کانوں میں جھمکے، گلے میں چاندی کی ہنسلی۔ بھرا بھرا گدرا ہوا بدن اور اس پر اس کے پسندیدہ پیلے رنگ کا لباس۔ جب وہ سرسوں کے پیلے پیلے چمکدار اور پرکشش پھولوں والے گیہوں کے لہلہاتے ہوئے کسی کھیت کے کنارے کی پگڈنڈی پر کھڑی ہوئی نظر آجاتی تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے شباب کے ساتھ کھیت کا شباب بھی انگڑائی لے کر جاگ گیا ہے۔ تب ایسے میں اس کا جی ہوتا کہ اسے گود میں اٹھالے اور کھیتوں کی پگڈنڈی پر دوڑتا چلا جائے۔ اسے اپنے میں سمالے یا اس میں سما جائے۔ حسن، عشق، چاہت، جسم، دھرتی اور آسمان پھر سب ایک ہو جائیں۔ اور ایک ہوتے ہوتے بھلے ہی وہ مر جائیں۔

لیکن ان کے مِلن کے آڑے آگیا ان کا سماج۔ سماج کے اپنے عقیدے اور

کھو کھلے دیرینہ رواج۔

ایک سال کا وہ وقت بڑا ہی خوبصورت تھا کہ جب وہ دونوں کھڑی فصل کی چوکسی کے بہانے اور فصل کٹنے کے دوران اپنے اپنے کھیتوں سے تھوڑا آگے آکر کھانکر کے درختوں کے جھنڈ میں...... یا پھر کچھ اور آگے جا کر بے حد سنسان جگہ پر کرونڈے کی جھاڑیوں کے نیچے مل بیٹھتے تھے۔ وہ نزدیک آکر اس کے گلے لگ جاتی تھی...... یا پھر وہ اسے بانہوں میں بھر لیتا تھا۔ دو جوانیوں کی قربت اور اس قربت میں سماج کے خوف سے دونوں کے ہی دل دھڑکنے لگتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ سماج کے بندھنوں کی حدود پھلانگ کر جسموں کی...... کے ذریعہ اپنی دلربا کی روح کی گہرائیوں میں چلا جائے مگر فضا میں ہی آس پاس تیرتا خوف اتنے خوبصورت عمل کے لئے مانع رہا۔ یا پھر اس کی پیاری پیاری باتیں ہی سارا وقت لے لیتی تھیں۔

''تیرے علاوہ مجھے کچھ اچھا نہ لگے ہے۔ جانتا ہے، رات بھر میں سوئی ہی نہیں......''

''کیوں نہیں سو سکی—؟'' اس نے بے حد پیار سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''تیری یاد میں۔ اور کس لئے؟ رات بھر تُو ہی تو یاد آتا رہا۔ نیند آئی ہی نہیں۔ میں کیا کروں''

''سوئے گی نہیں تو بیمار پڑ جائے گی''

''بیمار پڑ جاؤں کہ مر جاؤں، تجھے کیا—؟''

''مجھے کیوں نہیں۔ اب میں ہی تو تیرا ہوں۔''

''اور جو مجھے ابا نے صمد کے گھر بھیج دیا تو—؟''

اب میں تجھے صمد کے گھر نہیں جانے دونگا۔ تجھے لے کر شہر بھاگ جاؤں گا۔''

''میرے بھائی تجھے ڈھونڈ لیں گے اور مار ڈالیں گے۔''

''اب تو کچھ بھی ہو، میں جان دے دوں گا مگر تجھے صمد کے گھر نہیں جانے دوں گا۔''

''وہ بہت خطرناک ہیں۔''

''پرواہ نہیں۔ وہ یا تو ہمیں ڈھونڈ ہی نہیں سکیں گے یا مار ڈالیں گے، اس سے

جاتی اور کیا ہوگا......''

حسنیٰ بچپن سے ہی خوبصورت تھی۔ سولہ برس کی ہوئی تو کچھ اور بھی نکھار آیا تھا۔ باپ نے سوچا تھا کہ وہ ضرور کسی بہت مالدار گھرانے میں بیاہی جاسکے گی اور ایسا ہوگیا تو زندگی بھر عیش کرے گی۔ اس گاؤں میں تو سبھی چھوٹے کاشتکار ہیں اور غریب ہیں، اس لئے حسنیٰ کی شادی تو وہ اس گاؤں میں کرے گا ہی نہیں۔

اور پھر اس کے والد کی مرضی کے مطابق ہی ہوا۔ دور دراز کے گاؤں کے ایک مالدار جو گھرانے کا رشتہ آیا۔ پورے گھرانے کی قریب دوسوا ایکڑ زمین تھی۔ تین ٹریکٹر تھے اور دو جیپیں تھیں۔ باپ راضی ہوگیا۔ اب سے تین سال قبل حسنیٰ کی شادی صمد سے طے کردی گئی تھی لیکن شادی لڑکی کے بالغ ہونے پر کرنا طے پایا گیا تھا۔ پھر وہ بالغ ہوئی اور شادی کرنے کا وقت آیا تو کسی اور ذریعہ سے اطلاع ملی کہ بلاتکار کے ایک کیس میں صمد گرفتار ہوگیا۔ وہ ضمانت پر رہا تو ہوگیا تھا مگر کیس چلتا رہا۔ اسی دوران اطلاع آئی کہ صمد کے والد صمد کی شادی حسنیٰ سے اب جلد ہی کردینا چاہتے ہیں۔ حسنیٰ نے ایسے عیاش سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ ماں اس کے ساتھ تھی مگر باپ کی رائے تھی کہ اگر لڑکا کیس سے بری ہوگیا تو وہ بیٹی کی شادی صمد سے ہی کرے گا۔ حسنیٰ کے چاروں بھائی باپ کے ہم خیال تھے۔

حسنیٰ شباب کے لوازموں سے بھرپور تھی۔ اسی دوران ممدو بار بار اس کے سامنے آیا۔ ممدو کے باپ رحیم خاں بوڑھے ہوگئے تھے تو کھیتی کی دیکھ بھال ممدو ہی کرنے لگا تھا۔ حسنیٰ اپنے کھیتوں پر جاتی تھی اور ممدو اپنے کھیتوں پر۔ دونوں کے کھیت زیادہ دور نہیں تھے۔ ایک مقام پر تو دونوں کے کھیتوں کو بس ایک مینڈ جوڑتی تھی اور اس پر سے وہ دونوں اپنے اپنے کھیتوں پر جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ دونوں نزدیک بھی ہوجاتے تھے اور کوئی کوئی بات بھی کرلیتے تھے۔ کبھی کھیتی کی بات تو کبھی گھر والوں کی بات۔ ممدو بچپن میں سڑا سوکھا سا تھا لیکن اب وہ گلابی مائل پرکشش چہرے اور مضبوط بدن کا وجیہہ نوجوان تھا۔ گاؤں میں کوئی نوجوان اگر حسنیٰ کے لائق تھا تو وہ یہ ممدو ہی تھا۔ اور پھر دونوں ہی میواتی سماج کے تھے۔

ایسی دو جوانیاں زیادہ دن دور نہیں رہ سکتیں۔ ان میں مقناطیس ہوتے ہیں جو ایک دوجے کو قریب لا کر رہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ دونوں نزدیک آتے گئے اور ان

کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ وہ دونوں اپنے کھیتوں کے پاس کی جھاڑیوں میں ملتے تھے لیکن چوری چوری سے۔ پکڑے جانے کی پرواہ کیئے بغیر۔

''اے حسنٰی، دور دور تک کوئی نہیں ہے، آجا'' وہ اسے ہلکے سے آواز دے کر بلاتا۔

اور وہ ادھر اُدھر دیکھ کر پاس آجاتی۔ پاس آجاتی تو جیسے جنت اس کے ہاتھ لگ جاتی۔ وہ بہت قریب آجاتے۔ بانہوں میں جھول جاتی اور وہ آنکھیں بند کر لیتا اور کسی جنّت میں پہنچ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پھر آنکھیں کھولتا اور باتیں شروع ہو جاتیں۔ ان کی محبت کی راہ میں صمد ایک بڑا پتھر تھا جسے راہ سے ہٹانا بہت مشکل تھا۔ صمد سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے اور ان کا ملن کیسے ہو، اسی موضوع پر باتیں ہوتیں یا پھر پیار محبت کی باتیں ہوتیں۔ وہ اس کے چہرے کو دیر تک دیکھتا رہتا۔ کس قدر خوبصورت ہے حسنٰی، کہ کیا چاند ہوگا۔ اتنے قریب آکر اگر وہ اس سے جدا ہوگئی تو پھر کیا ہوگا اس کا۔ اس دنیا میں حسنٰی کے بغیر وہ کیسے جیئے گا۔ زندگی سچ مچ ان دونوں کے لئے کس قدر مشکلات لے کر آئی ہے۔ ایسا کیوں خود بخود نہیں ہو جاتا کہ صمد ان کی راہ سے ہٹ جائے اور حسنٰی کی شادی سے اس سے ہو جائے۔ ایسا کیوں نہیں ہو جاتا...... کیوں نہیں ہو جاتا......؟

اور پھر...... جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ ہو گیا۔

گاؤں کی ایک لڑکی نے ان دونوں کو ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھا دیکھ لیا۔ اور پھر حسنٰی کے گھر جا کر کہہ بھی دیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے گھر چلے تو گئے مگر ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حسنٰی کی پٹائی ہوگئی اور اس کے چاروں بھائی کنویں کے کھیت پر بنے ممدو کے باپ حاجی رحیم خاں کے گھر آ گئے۔ اور آ کر گھر کے آنگن میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے بڑا بھائی حاجی رحیم سے بولا۔

''ممدو کو باہر نکالو حاجی۔ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

حاجی نے آگ بگولہ ہو کر بندوق اٹھالی اور گھوڑا چڑھالیا۔ اور بولا ''اگر ایک بھی آگے آیا تو سڑائے مارنا کو نگا، میرے بیٹے پہ تم جھوٹا الزام لگائے ہو، مجھ سے کوئی پرانا بدلہ نکالنے آئے ہو۔''

''سائرہ سے پوچھ لو۔ اس نے دیکھا ہے کہ ممدو نے ہماری بہن کو پکڑ لیا تھا''

''اور حسنیٰ کیا کہتی ہے؟''

''وہ بھی کہتی ہے کہ ممدو نے جبراً اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی عزت لینا چاہتا تھا۔''

''وہ جھوٹ بولتی ہے۔ ممدو ایسا نہیں کر سکتا۔ کبھی آج تک کسی کے ساتھ اس نے ایسا نہیں کیا۔ حسنیٰ خود اس کے پاس گئی ہوگی۔''

''تم ہماری بہن پر الزام لگا رہے ہو حاجی۔ ممدو کو باہر نکال کر اس سے پوچھو۔ ابھی بات صاف ہو جائے گی۔''

''وہ باہر نہیں آئے گا، اس کی ماں کا حکم ہے۔ اور تم شیطان بن کر آئے ہو۔''

''کب تک باہر نہیں آئے گا؟ دو دن، چار دن، آٹھ دن، مہینہ، دو مہینہ...... ایک بات کان کھول کر سن لو تم، اب ہم اسے چھوڑیں گے نہیں، چھ مہینے بعد بھی نہیں۔ اور سال بھر بعد بھی نہیں۔ ہم اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں ضرور کاٹیں گے...... تم دیکھ لینا......''

اور وہ چلے گئے۔ گھر میں دہشت چھوڑ گئے۔

اور ممدو کے لئے سب کچھ ختم ہو گیا۔ پر فضا ماحول میں آزادی سے گھومنا پھرنا اور دوپہریوں میں حسنیٰ کو اپنے قریب کر لینا اور سرگوشیوں میں اس سے باتیں کرنا اور دیگر سب کچھ بھول جانا۔ حسنیٰ بھی دور ہوئی اور آزادی بھی گئی۔ اور سر پر مصیبت آ گئی۔ وہ گھر پر آ کر کہہ گئے کہ وہ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹ ڈالیں گے۔ وہ غلط نہیں کہہ گئے۔ وہ بہت جاہل ہیں اور غصے میں پاگل ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی لوگوں کے ہاتھ پیر برابر کئے ہیں اور فوجداری کیس بھی لڑے ہیں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان سے سب ڈرتے ہیں۔ وہ ضرور اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر......

اس نے باپ سے کہا تھا کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتا، وہ ان کا مقابلہ کرے گا اور دیکھ لے گا وہ بھی ان کو۔ مگر باپ نہیں مانے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر ممدو گاؤں میں رہا تو کسی دن دھوکہ کھائے گا اور اپاہج ہو کر رہ جائے گا۔ وہ لوگ ضرور اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ ڈالیں گے اور پھر کوئی گواہ نہ ہونے کی صورت میں عدالت سے بری کر دیئے جائیں گے۔ پانچ سال قبل پاس کے قصبے کے ہیلتھ سینٹر کے ایک ڈاکٹر نواز خان سے اس کے والد کے گھریلو تعلقات ہو گئے تھے۔ پھر ڈاکٹر نواز تبادلے پر قریب کے بڑے شہر چلے گئے تب بھی

ان کے یہاں اس کے گھر والوں کا جانا آنا رہا۔ ڈاکٹر نواز ویسے بھی میواتی لوگوں میں، انکی چند خصوصیات کے باعث دلچسپی رکھتے تھے۔ کہتے تھے کہ میواتی لوگ بہت کھرے، سچے اور پر خلوص ہونے کے ساتھ ساتھ بہت محنتی ہوتے ہیں۔ اور لہذا حاجی رحیم نے ممدو کو شہر لا کر ڈاکٹر نواز کے گھر چھوڑ دیا۔ کہ کچھ وقت گذر جائے گا تو پھر سب کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

اور اب وہ سب ایک خواب جیسا ہی تو تھا۔ گاؤں...... جا بجا ہرے بھرے درخت ...... ہر طرف ہریالی...... کھیت کھلیان...... ان کے درمیان پگڈنڈیاں...... جھاڑیاں...... ندیاں...... ان پر اڑتے پرندے...... آزادی کی فضا...... تنہائیوں میں حسنیٰ سے ملاقاتیں ...... ملاقاتوں کا لطف...... قربتیں اور سرگوشیاں......

لیکن بدبختی اسے شہر لے آئی۔ اور اب وہ سزا بھگت رہا تھا۔ حسنیٰ سے ملنے کی، اسے اپنا بنانے کی سزا۔ سزا، جو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ دو ماہ ہو گئے تھے لیکن ابا نے یہ اطلاع نہیں بھیجی کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ یعنی خطرہ اب تک ٹلا ہی نہیں۔ وہ لوگ یعنی اس کے چاروں بھائی سچ مچ خونخوار جانوروں کی طرح ہیں۔ اگر وہ واپس گاؤں چلا گیا تو کیا سچ مچ وہ لوگ اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر کاٹ ہی ڈالیں گے؟ پر یہ سزا تو کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ صمد نے تو ایک مزدورنی، یعنی ایک مجبور عورت کے ساتھ بلاتکار کیا تھا، پھر بھی اس کے ہاتھ پیر کسی نے نہیں کاٹے۔ وہ تو عدالت سے بری بھی کر دیا گیا۔ اس نے تو حسنیٰ سے پیار ہی کیا تھا اور اسے اپنانا چاہا تھا۔ اس کے بھائیوں کو اپنا رشتہ دار بنانا چاہا تھا۔ اور اس میں برا تو کہیں سے کچھ نہ تھا۔ پھر کیوں ایسی سزا ان جاہلوں نے تجویز کی؟

تو پھر وہ کیا کرے — ؟ آخر کب تک وہ شہر میں پاگلوں کی طرح بھٹکتا پھرے گا اور ڈاکٹر نواز پر کب تک بوجھ بنے گا؟ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے وہ۔ حسنیٰ بھی گئی اور آزادی بھی۔ اے خدا بس تو ہی اس مصیبت سے نکالنے والا ہے۔

اس کی نگاہ کبھی اس کے خود کے بدن پر پڑتی تو اپنے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر بھی چلی جاتی۔ اور تب وہ سوچتا کہ ان میں سے اس کا ایک ہاتھ اور ایک پیر نہیں رہیں گے اور وہ اپاہج ہو جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے بدن میں جھرجھری آجاتی — ایک ہاتھ...... اور ایک پاؤں......

ڈاکٹر نواز بھلے آدمی تھے۔ مذاق مذاق میں اسے ڈراتے ''بیٹا تم ماننے والے نہیں ہو۔ تمہاری حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ جلد ہی اپنے گاؤں جاؤ گے اور عشق میں اپنے ہاتھ پیر گنوا دو گے۔ لیکن ہاتھ پیر چلے گئے تو پھر عشق بھی کیسے کرو گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ میرے کمپاؤنڈر بن جاؤ اور دوسروں کے دکھ درد کا علاج کرو۔ میں یہاں تمہاری شادی بھی کرادوں گا۔ ہاتھ پیر تو بچ جائیں گے۔

اور وہ ہنس کر رہ جاتا۔

اس کا ایک راز دار دوست رحیما پانچ سات دنوں میں گاؤں سے شہر آجایا کرتا تھا تو وہ اس سے گھر والوں کی اور حسنیٰ کی خیریت پوچھ لیا کرتا تھا۔ اور اپنے دل کی باتیں بھی اس سے کر لیا کرتا تھا۔ اس بار جو وہ گاؤں سے آیا تو اس نے رحیما سے پوچھا۔

''مجھے حسنیٰ کی بہت یاد آئے ہے۔ میں اس کے بنا اب نہیں رہ سکتا۔''

''تُو شاید بھول گیا، حسنیٰ نے تجھ پر الجام دھرا تھا اور کھُد کو بچا لیا تھا۔ تیرے سنگ اس نے دغا کی۔ اور پھر بھی تو اسی کے گانے گائے ہے......''

''گھبراہٹ میں بول ہو گئی ہو گی وہ۔ اپنی جان اس نے بچالی تو اچھا ہی تو کیا۔ لیکن مجھے یکین ہے کہ وہ مجھے دل سے چاہتی ہے۔ اب وہ بھی مجھے بہت یاد کرتی ہو گی۔''

''تُو تو اب اسے بھول ہی جا ممدو...... نہیں تو......''

''نہیں تو کیا؟ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں...... ابے میں ڈرتا نہیں ہوں ان سے۔ وہ تو ابا یہاں چھوڑ گئے نہیں تو نپٹ لیتا ان سالوں سے۔ میں بھی ان سے کم ہوں کیا۔ وہ میواتی ہیں تو میں بھی میواتی ہوں۔ اگر مجھ سے بھِڑ جاتے تو ایک دو کا سر پھوڑ ہی دیتا۔''

''سال چھ مہینے تو نکل جانے دے۔ معاملہ دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہی پڑ رہا ہے۔''

''پر دیکھ بہت دن ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔ اب اس کی بہت یاد آئے ہے۔ رات کو نیند بھی نہیں آتی۔ ہر وقت وہ ہی نظر آتی ہے۔ اب ایک بات سن لے۔ اگلے اتوار کو ٹھیک دو بجے میں گاؤں کے باہر نالے کے پاس والے کھیت کی مینڈ پر آجاؤں گا کھانکرے کے پیڑوں کے جھنڈ میں۔ تُو حسنیٰ سے بول دینا کہ اسی وقت وہ بھی وہاں آجائے۔ ہم کچھ

دیر مل لیں گے۔ تسلّی ہو جائے گی، پھر میں واپس آ جاؤں گا اور دو ایک مہینے پھر شہر میں کاٹ لوں گا......"

"دیکھ میں پھر تجھے سمجھاتا ہوں۔ تو خطرہ مول موت لے۔ بس دو مہینے اور گذار لے۔"

"اب میں جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔ تو ڈرتا بہت ہے۔ حسنٰی سے بول دینا کہ میں اتوار کو آ رہا ہوں۔ ٹھیک دو بجے......"

اور پھر...... ڈاکٹر نواز کو اطلاع دیئے بغیر وہ اتوار کے دن بس میں بیٹھ کر اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ پہلے روڈ پر اترا، پھر راستوں اور پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر درختوں کی آڑ لیتا ہوا کوئی دو فرلانگ چل کر نالے پر پہنچ گیا۔ نالے پر رحیما کھڑا تھا۔ اس نے کھانکر کے درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ اشارے کا مطلب تھا کہ حسنٰی وہاں موجود ہے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور ببول کے درختوں کی آڑ میں سے ہوتا ہوا کھانکر کے درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ حسنٰی سچ مچ وہاں موجود تھی۔ وہ لپٹ گئی اس سے۔ اور رونے لگی—

"صمد کیس میں بری ہو گیا ہے اور اس کا باپ صمد کی شادی مجھ سے طے کرنے آنے ہی والا ہے۔"

ممدو چپ ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی محبت کے اردگرد شکنجہ کچھ اور بھی کس گیا ہے۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ لیکن یہ سب تو وہ شہر جا کر سوچے گا............ لیکن اس کے سوچنے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ ان دونوں کا ملن تو لگتا ہے کہ ہونے والا ہی نہیں۔ اور شاید یہ ان کی آخری ملاقات ہو۔ اب اگر ملاقات آخری ہے تو وہ ذرا دل بھر کے تو ہو۔

وہ دونوں پاس ہی کے گیہوں اور سرسوں کے کھیت میں چلے گئے اور نیچے بیٹھ گئے تو سرسوں کے پودھوں کی آڑ میں چھپ گئے۔ اب بس اوپر آسمان تھا اور نیچے حسنٰی—وہ پھر آغوش میں آ گئی۔ جی کرتا تھا کہ وقت رک جائے، حسنٰی ایسے ہی اس کی آغوش میں رہے اور اس کے دل کو سکون ملتا رہے۔ سکون جو اس سے مہینوں سے چھن گیا ہے۔

"تو ایسا کر کہ صمد سے شادی کرنے سے صاف منع کر دے۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے وہاں تیری خرابی ہو جائے گی......"

''میں کیا کروں...... میں یہ سب جانتی ہوں لیکن ابا نہیں مانیں گے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں،، بہت ضدی انسان ہیں۔''

''ابھی ٹائم ہے، تیرے جو بھائی اچھے ہوں ان کو سمجھا۔ مرجانے کی دھمکی دے......''

''ارے سب بے کار ہے ممدو، میرے بھائی تو اور بھی خراب ہیں، پکے جاہل ہیں، انہیں صمد اچھا لگتا ہے،، بہت پیسے والا ہے نا......؟

''چلو سوچیں گے پھر۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بات کروں گا۔ کوئی راستہ نکلے تو ٹھیک، نہیں تو یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ اس آخری ملاقات کو ہم خراب کیوں کریں۔''

''لیکن زیادہ دیر مت کر، تیری جان کو خطرہ ہے۔ کسی نے مجھے آتے دیکھ لیا ہو تو؟''

''تیری خاطر جان ہی جائے گی اور کیا ہوگا——؟''

''ایسی بات منہ سے مت بول۔ تو نہ رہا تو میں جی کے کیا کروں گی۔''

''وہ صمد بہت پیسے والا ہے۔ وہاں خوش رہے گی۔''

''میں جان دے دوں گی، لیکن اس سے شادی نہیں کروں گی۔''

''میری وجہ سے تجھے کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔''

''ایسا مت بول...... پریشانی تو ابا نے اور بھائیوں نے پیدا کی ہے، وہ انسان کو نہیں دولت کو دیکھ رہے ہیں......''

اور اسی وقت رحیما کے چلاّنے کی آواز آئی۔ وہ دوسری بار پھر چلاّیا۔

''اے ممدو، وہ آرہے ہیں، جلدی سے بھاگ...... اے جلدی کر رے......''

دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت دور، دو کھیتوں سے آگے، آم کے درختوں کے جھنڈ کے پاس بہت سے لوگ تیز تیز چلے آرہے تھے۔ دور تھے لیکن چار پانچ منٹ میں آکر دبوچ ہی لیں گے۔ ان کو دیکھ کر وہ نروس ہو گیا تھا اور ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے۔ تو کیا سچ مچ آج وہ اپنے ہاتھ پیر کھو دے گا اور اپاہج ہو جائے گا...... اس نے رحیما کو دیکھا...... وہ ہاتھ ہلا رہا تھا۔ یعنی اپنے پاس بلا رہا تھا۔

''میں جا رہا ہوں حسنی، رحیما کی سائیکل سے۔ سائیکل پر دوڑ لگاؤں گا۔'' تو وہ

نہیں پکڑ سکیں گے۔ تُو جا...... اللہ حافظ ہے تیرا...... سب کچھ عقلمندی سے کرنا۔ اللہ مدد کرے گا......"

"میں تیرے ساتھ چلوں گی۔ ان قصائیوں میں اب نہیں رہنے والے۔ جئیں گے تو ساتھ اور مریں گے تو ساتھ......"

"دیکھ مان جا...... ہم دونوں تو بھاگ بھی نہیں سکیں گے......"

"کچھ بھی ہو...... میں اب یہاں نہیں رکوں گی اور تیرے ساتھ ہی......"

ممدو بھاگا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی — پھر ممدو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور وہ دونوں بھاگے — مینڈ پر رحیما کھڑا تھا۔

"حسنیٰ بھی میرے ساتھ جارہی ہے۔ تو اسے سائیکل پر لے کر چل میں بھی دوڑ کر آتا ہوں۔"

"یہ کیسے......؟"

"ابے ٹائم نہیں ہے۔ بٹھا اسے جلدی سائیکل پر......"

وہ سب ان تینوں کی جانب دوڑے۔ رحیما نے حسنیٰ کو سائیکل پر بٹھایا اور پگڈنڈی کے راستے سائیکل دوڑائی۔ اور ممدو نے پیدل ہی بہت تیز بھاگنا شروع کیا۔ پوری طاقت سے۔ دوڑتے دوڑتے وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "آج اگر بیٹا تو رک گیا یا سست پڑ گیا تو جان سے جائے گا...... یا پھر...... ایک ہاتھ اور ایک پاؤں...... وہ آج تو چھوڑیں گے ہی نہیں...... اس لئے بھاگ...... اور تیزی سے بھاگ...... اور تیزی سے......

وہ سب کے سب بھاگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے۔ کوئی زندگی لینا چاہتا تھا اور کوئی زندگی بچانا چاہتا تھا۔ یہ دوڑ چلتی رہی۔ بہت دیر تک چلتی رہی۔

اور بھاگتے بھاگتے سڑک آہی گئی۔ پہلے حسنیٰ پہنچی اور پھر ممدو۔ وہاں ایک ٹیکسی جیپ مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ سب بھی قریب آہی گئے تھے مگر ممدو نے ڈرائیور کے ہاتھ میں پانچ سو روپے کا ایک پیلا نوٹ تھما دیا — ڈرائیور کبھی نوٹ کو دیکھتا تھا اور کبھی دوڑ لگا کر نزدیک آتے ہوئے انسانوں کے جھنڈ کو پھر اس نے گیئر ڈالا اور جیپ آگے بڑھا دی۔

☆☆

گیارسی

چل چل کے...... چل چل کے...... چل چل کے اس کے پاؤں جیسے چلنی ہو گئے تھے۔اُف...... مار ڈالا جالم نے...... نہ جانے کدھر کو چلی گئی۔جمین کھا گئی اسے کہ آسمان کھا گیو...... کہیں پہ ملتی ہی نہیں ہے...... سارے میں ڈھونڈ لیا۔اپنے گاؤں میں، ہر گاؤں میں، اپنوں میں اور گیروں میں۔اور کھد گئی تو گئی دونوں بچّوں کو بھی لے گئی۔میرا تو گھر ہی بگڑ گیا۔کیسا برا لگے ہے۔ایک دم کھانے کو دوڑے ہے...... سالی...... حرامجادی...... کمینی......

وہ روزانہ یہی کرتا تھا۔صبح منہ اندھیرے جو اسے ڈھونڈنے نکلتا تو بھوکا پیاسا سارے میں ڈولتا پھرتا تھا۔پہلے اپنے گاؤں گونڈی پورہ میں، پھر گاؤں سے نکل کر آس پاس کے گاؤں میں۔اور کبھی کبھی تو کوئی بس پکڑ لیتا تو رشتے داروں میں دور کے گاؤں بھی دیکھ آتا تھا۔اور ایسے ایسے ہی ایک ماہ گزر گیا تھا۔گاؤں کے کچھ لوگ اس پر ترس کھاتے تھے تو کچھ لوگ اسے ہی برا بھلا کہتے تھے۔کہ مار پیٹ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔کوئی عورت آخر کب تک آدمی کی مار کھائے گی۔اور پھر گیارسی تو دو بچّوں والی ہو گئی۔بچوں والی عورت کو کون بھلا مانس مارتا ہے۔اچھا ہی ہوا جو وہ بھاگ گئی سُسری۔ارے پیٹ تو وہ اپنا کہیں بھی بھر لے گی۔اب کیسا ڈولتا پھرتا ہے۔اس کے لئے پاگل سا ہو گیا ہے۔اب پتہ چلا بیٹا کو کہ گھر کی عورت کیا ہوتی ہے۔گھر کی عورت کو تو اس نے کچرہ کوڑا ہی سمجھ رکھا تھا۔ارے گھر کی دیوی کی جو مرد عزّت کرے ہے وہی پھلے پھولے ہے......

اور گاؤں والوں کی اس طرح کی باتیں اس کے کانوں میں بھی پڑ جاتی تھیں۔کوئی کوئی بوڑھی عورت تو اس کا لحاظ کئے بغیر اس کے منہ پر ہی یہ سب بول دیتی تھی۔اور وہ

سنتا تھا۔ کیونکہ بیوی بچے چلے جانے سے اور گھر بگڑ جانے سے اس کے دل و دماغ میں بہت تکلیف تھی۔ وہ ہر ایک کی بات سن لیتا تھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا تھا۔ پہلے کا وقت ہوتا تو کس میں ہمت تھی جو اس کے خلاف ایسی خراب خراب باتیں بول دیتا۔ ٹیم ٹیم کی بات ہے۔ سب ٹیم ٹیم کی بات۔ ٹیم کھراب ہے تو ہر کوئی بول رہا ہے اور وہ سُن بھی رہا ہے۔ سالی عورت نے سننے کے لئے مجبور جو کر دیا ہے۔ اس نے کیسا کھراب بدلہ لیا...... کہ وہ گھر چھوڑ کے چلی ہی گئی۔ اور جا کے میرے دل کو ایک دم توڑ گئی۔ مجھے کا معلوم تھا کہ عورت میں اتنی کھاس بات ہووے ہے...... کہ اس کے بنا تو سبھی کچھ برا لگے ہے...... سبھی کچھ......!

اس کا نام سردار ہے۔ اور یہ سردار کسی قبیلے کا سردار نہیں بلکہ صرف نام کا سردار ہے۔ اور ذات کا بنجارہ ہے۔ گونڈی پورہ میں بہت سال پہلے اس کے ماں باپ کہیں سے آ کر بس گئے تھے۔ اپنی عمر جی کر پھر دونوں مر گئے۔ گاؤں میں کوئی پانچ ایکڑ زمین اور ایک ہی بیٹا چھوڑ گئے تھے۔ وہ پندرہ برس کا تھا جب دونوں ماں باپ دنیا سے چلے گئے تو کوئی کہنے اور سمجھانے والا نہیں رہا اور اس کو بے راہ روی کے راستے پر چلنے سے نہیں روک سکا۔ وہ تو بھلا ہوا اس کے رشتے کے ایک ماما بلدیو کا جس نے اکیس سال کی عمر آتے آتے برادری میں ہی ایک غریب بوڑھے چرواہے کو سمجھا بجھا کر اس کی بیٹی گیارسی سے اس کا بیاہ کرا دیا تو اس کا گھر بس گیا۔ نہیں تو داروپی کر وہ اِدھر اُدھر ڈولتا پھرتا تھا اور گھر اجاڑ اجاڑ سا پڑا رہتا تھا۔ اور پانچ ایکڑ زمین کو سال بھر کے لئے گاؤں میں کوئی نہ کوئی بٹیا پر رکھ لیتا تھا۔ عورت آئی تو زمین پر دونوں نے مل کر ہل بکھر چلائے۔ اور دونوں نے ہی نزدیک کے کجلی کھیڑا گاؤں میں طارق میاں اور غازی میاں کے اینٹ کے بھٹے پر مزدوری کر کے کھانے پینے لائق خوب کمایا، اتنا مل جاتا تھا کہ گھر کے کھانے کے ساتھ باہر جا کر سردار کا دارو پینے کا خرچ بھی چل جاتا تھا۔

گیارسی نے اس کو سمجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مگر پئے بغیر وہ مانتا ہی نہ تھا۔ رات میں جب سونے کا وقت آ جاتا اور وہ پلنگ پر گیارسی کو اپنی جانب کھینچتا تب گیارسی دور سرک جاتی اور کبھی کبھی تو نیچے اتر کر کھڑی ہو جاتی۔ اور تب کہتی

"ہٹ دور۔ دارو کی باس مجھے اچھی نہیں لگے ہے۔ تو کو میں نے کتی بار سمجھایا کہ اب اپنے دو دو بچے ہیں، پینا چھوڑ دے، پن تُو مانے ہی کب ہے...... داروپی کے موئے

ہات مت لگا......"

کبھی تو وہ ہنس دیتا اور منت سماجت کرنے لگتا اور شراب سے توبہ کر کے اسے راضی کر لیتا۔ یا پھر وہ زیادہ ہی گڑبڑ کرتی تو ایک ہاتھ جما دیتا اور اسے کھینچ کر پلنگ پر گرا دیتا۔

روتے روتے وہ بولتی "کوئی جور جبر دستی ہے کا......؟"

"کھالی پیلی نکھرے کائے کرت ہے، رہنا ہو تو رہ، نہیں تو سالی حرامجادی جا اپنے گھر، میں دارو نئیں چھوڑ سکت ہوں......"

اور وہ رونے لگتی۔ اور اپنی زندگی کو اور اپنے باپ کو کوسنے لگی۔ پریشانی یہ تھی کہ دن میں یا رات میں دارو پی کر وہ خاموش نہیں بیٹھتا تھا بلکہ غصہ کرتا تھا۔ وہ غصے میں گالیاں بکتا تھا اور کبھی کبھی اسے مار بھی بیٹھتا تھا۔ اچھا کس کے مارتا تھا اور یوں اس کے دارو چھوڑ دینے کی امید جاتی رہی تھی۔ گیارسی کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اس نے۔

دارو، غصہ، جھگڑہ، مار پیٹ اور رونا دھونا یہی سب کچھ رات دن نظر آنے لگا تھا ان کے گھر میں۔ اور جب کسی گھر میں ان سب کی بھرمار رہنے لگے تو پھر یہ سب بہت جلد گھر سے باہر بھی آنے لگتے ہیں۔ گالیوں کی آوازیں اور پھر رونے دھونے کی آوازیں۔ پہلے لوگ سمجھاتے ہیں اور پھر عاجز آ جاتے ہیں۔ لیکن گیارسی سے تو سبھی گاؤں والوں کو ہمدردی تھی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں سردار کو کبھی نرمی سے تو کبھی گرمی سے سمجھاتی تھیں۔ مگر سب بے سود۔ وہ تو ایک چکنے گھڑے جیسا ہو گیا تھا۔ اور کرتا وہی تھا جو اسے کرنا ہوتا تھا۔ شراب، غصہ اور مار پیٹ۔ اس سب کے بغیر اس کے وجود کا تصور کرنا محال تھا۔ اور جب کسی کی تصویر سماج میں ایک بگڑیل آدمی کی بن گئی ہو تو وہ بدنام ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کی عزت نہیں کرتا۔ اور کوئی اس کے قریب بھی نہیں آتا۔ ایک منہ زور نشیلے آدمی سے بات کرنا بھلا کون پسند کرے گا۔ بس ایک بیوی ہی ہوتی ہے جو بہت حد تک ایسے بگڑیل کا ہر طرح ساتھ دیتی رہتی ہے۔ لیکن آخر کب تک؟ اگر بیوی ایک دم بے شرم اور بے حس نہ ہو گئی ہو تو ایک دن وہ بھی اپنے اس طرح کے شوہر سے بغاوت کر دیتی ہے۔ اور تیاگ دیتی ہے اپنے گھر سنسار کو۔

اور یہی تو کیا گیارسی نے۔ تیاگ دیا اپنا شوہر اور اپنا گھر سنسار۔ اور چلی گئی نہ جانے کس منزل کی جانب۔ وہ ڈھونڈتا رہا۔ اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر بہت تھک گیا مگر وہ نہ ملی۔ رشتے

داروں اور جان پہچان والوں کا اس نے کوئی گھر نہیں چھوڑا۔ وہ کام کم کرتا تھا، کھانا بھی کم کھاتا تھا اور اب دارو بھی کم پیتا تھا مگر اسے ڈھونڈتا بہت تھا۔

اب سمجھ میں آیا اسے کہ اس کی زندگی میں گیارسی کی اہمیت کیا تھی۔ گیارسی تھی تو جیون میں بڑی رونق تھی۔ گھر سنسار ٹھیک طرح چل رہا تھا۔ ہر چیز میں چمک دمک تھی اور ہر چیز میں مزہ ہی مزہ تھا۔ وہ گئی تو جیسے سب کچھ گیا۔ سب کچھ بے رونق اور ویران ہو گیا۔ اسے سوچ سوچ کر حیرت ہوتی تھی کہ دنیا کی ساری خوبصورتیاں اور کشش سمٹ کر ایک عورت میں کیسے آ جاتی ہیں۔ گھر کی عورت میں۔

دراصل شراب اس کے اعصاب پر حاوی ہو گئی تھی۔ اور وہ شراب کا عادی ہو چکا تھا۔ اور یہ فطری بات ہے کہ جب کوئی کسی خراب چیز کا بُری طرح عادی ہو جائے تو پھر اس چیز کی خرابی اسے نظر ہی نہیں آتی۔ دھندسی چھا جاتی ہے آنکھوں کے سامنے۔

لیکن جب کوئی در در کی اور پگ پگ کی ٹھوکریں کھانے لگتا ہے تو نشوں کے خمار اترنے لگتے ہیں۔ گیارسی میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اسے ٹھوکریں کھلا رہی تھی۔ اینٹ کے بھٹے پر کام کرنے والے اس کے ساتھی کہتے بھی تھے کہ بھول جا گیارسی کو، اب وہ کبھی نہیں آئے گی، اس کے لئے اپنے آپ کو ختم مت کر۔ مگر وہ خاموش رہ کر ان سے ایک بار بھی ہاں نہیں کہتا تھا۔ وہ تھی بھی کتنی خوبیوں والی۔ گوری گوری، لمبا سا قد، دمکتا ہوا بھرا بھرا بدن، موہنی سی صورت اور کبھی کبھی بہت پیار سے دیکھنے اور مسکرانے والی۔ ٹائم پر مزیدار کھانا بنانے والی۔ اور کھیت میں لگ کر کام کرنے والی ایسی عورت اب اسے کہاں ملے گی۔ دس پانچ گاؤں تو کیا سارا سنسار ڈھونڈ لے تو کبھی نہیں ملے گی۔

ایک ماہ...... دو ماہ...... اور چار ماہ...... لیکن وہ نہیں آئی۔ دھرتی کھا گئی اسے کہ آسمان اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔

اور اب یہ روزانہ کا معمول تھا۔ کہ وہ صبح صبح سو کر اداس اداس سا اٹھتا۔ کچھ دیر تک تو پلنگ پر بیٹھا بیٹھا آنگن کی جانب گھورتا رہتا۔ تصور میں اسے گیارسی آنگن میں کام کرتی نظر آنے لگتی۔ نالی کے پاس برتن دھو رہی ہے...... یا پٹیئے پر کپڑے دھو رہی ہے...... یا آنگن میں چٹائی پر ایک ہاتھ سے مونگ کی بڑیاں کر رہی ہے اور دیہاتی زبان کا کوئی گیت گنگنا رہی

ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ایک سالہ بچے کو چٹائی پر آنے سے بار بار روکتی جاتی ہے......
یا...... باہر ہینڈ پمپ پر سے گھڑے میں پانی بھر کر لا رہی ہے اور دالان کے پاس داسے پر گھڑے پر گھڑا جما رہی ہے...... وہ تو سچ مچ بہت اچھی تھی...... ایک دم لکشمی تھی...... سارے اچھے کام وہ اپنے اسی گھر میں کرتی تھی...... لیکن فکر کی بات یہ تھی کہ اب وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بے حال سی ادھر اُدھر پھر رہی ہوگی...... اور یہ زمانہ کتنا کھراب ہے...... کہیں کسی کے پلّے نہ پڑ گئی ہو...... اور پلّے پڑ کر مورکھ نے اپنا سیتا پن نہ کھو دیا ہو...... ارے میں بھی کیسا اُلو کا پٹھا ہوں...... ایک سالی دارو کی کھاطر...... گھر کی دیوی کو گھر سے بے گھر کر دیا...... اور اپنا گھر بھی برباد کر لیا...... اور اپنے آپ کو بھی...... دھکار ہے ایسی دارو پر...... وہ آجائے تو میں دارو بالکل ہی چھوڑ دوں گا...... پن وہ آئے تو......؟

پلنگ سے اٹھ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر صبح نو بجے تک وہ گھر سے باہر نکل جاتا۔ کچھ دور چل کر روڈ پر آجاتا۔ روڈ پر منگت رام سندھی کے ڈھابے پر پیپل کے درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھ کر دو تین روٹیاں دال یا ساگ بھاجی کے ساتھ کھاتا اور پھر سیدھا اینٹ کے بھٹے پر چلا جاتا۔ کبھی تو وہاں بے دلی سے شام تک کام کرتا اور کبھی گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی بھٹے پر سے لوٹ آتا۔ اور گیارسی کو ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ حالانکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ گیارسی کا مل جانا ایک کرشمہ ہی ہوگا۔

یا تو وہ ریل میں بیٹھ کر دونوں بچوں کے ساتھ کسی بڑے شہر کو نکل گئی یا پھر کسی بہتی ندی میں ڈوب کر اس نے آتم ہتھیا کر لی۔ لیکن ایسے خراب حالات میں بھی امید کی ایک آدھ کرن اسے نظر آتی تھی۔ اسی امید کے سہارے وہ اسے پھر سے پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ سوچتا کہ وہ بھی کیسا مورکھ تھا جو اپنا بسا بسایا گھر اُجاڑ ڈالا اور اتنی اچھی سگھڑ عورت کو کھو دیا۔ گیارسی جیسی کوئی دوسری عورت اسے اس جنم میں تو کبھی ملے گی نہیں......

اے گیارسی...... اس دھرتی پر اگر کہیں تو موجود ہے تو میرے دل کی بات سن لے...... آجا واپس میرے لٹے ہوئے سنسار میں...... اور بنا دے پھر سے اس کو چمن...... میں اب کبھی دارو کو ہات نہیں لگاؤں گا...... میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ دارو ہی سبرے جھگڑے کی جڑ

ہے...... اور میرے جیسے آدمی کی سبری بربادی کا کارن...... کس سالے نے یہ دارو بنائی ہے
...... بُرا ہو اس کا......!

وہ شراب سے توبہ کرلیتا تھا۔ دو تین دن اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا۔ لیکن کسی رات جب غم چاروں طرف سے گھیر لیتے تو ان غموں کو مدہوشی میں ڈبا دینے کے لئے وہ تھوڑی بہت پھر پی جاتا۔ دکھوں کا کارن بھی وہی تھی اور تھوڑا بہت سہارا بھی سُسری وہی دیتی تھی۔ گہرے دکھ کے ٹائم اگر وہ اپنے غم کو اس میں ڈبا نہ دے گا تو اس کا کلیجہ پھٹ نہ جائے گا۔ گیارسی آجاتی تو پھر سچ مچ وہ دارو چھوڑ ہی دیتا۔ لیکن نہ آئے تو وہ اور کیا کرے۔ اپنے آپ کو بچا کر وہ کرے گا بھی کیا...... اس کا سنسار تو اجڑ ہی گیا ہے۔

زندگی کی اسی بے ڈھب چال کے دوران...... ایک روز...... گرمیوں کی شام میں وہ گھر سے باہر کھٹیا ڈالے اس پر اداس اداس سا بیٹھا تھا کہ گاؤں کی ایک مزدورنی اس کے پاس آکر پاس ہی میں رکھے ایک اونچے پتھر پر بیٹھ گئی اور پھر ادھر ادھر کی بات کرتے کرتے اس نے سردار سے کہا۔

''تُو گلت بولے ہے...... گیارسی ابھی جِندہ ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھن سے دیکھیا ہے۔''

سردار تن کر بیٹھا گیا۔ ''تو جھوٹ بولت ہے جھاڑلے والی۔ وہ جندہ تو جرور ہو سکے ہے۔ پن تو نے اسے دیکھا نہیں۔ اس کو چار مہینے سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں پن وہ مجھے نیئں ملی۔ اور تو کہت ہے کہ وہ تجھے مل گئی۔ تو ایسا مجاک مت کیا کر......''

جھاڑلے والی تھیلی میں سے چھالیہ نکال کر منہ میں پھنکار مار چکی تھی۔ تھوڑی دیر بکری کی طرح جگالی کرتے کرتے بولی ''اگر میں نے اس کا پتہ بتا دیا تو بول موئے کا دے گا......؟'' وہ بولی۔

سردار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنا سنکر اسے لگا کہ جھاڑلے والی ضرور سچ بولے ہے...... تو پھر تو گیارسی اب اسے مل جائے گی...... یہ جھاڑلے والی جرور اسے کہیں پہ دیکھ آئی ہے۔

''تیرے منہ میں گھی سکر۔ ارے میرا گھر پھر سے بس گیا تو تُو جو کہے گی وہ میں

تجھے دوں گا۔ بتا جلدی سے تو نے اسے کِتے دیکھیو ہے؟

جھاڑے والی پتھر سے اٹھ کر اس کی کھٹیا پر آ بیٹھی۔ پھر بولی ''میرا نام تو ئیں لے گا نا؟''

''نئیں لوں گا۔ پن تو ڈرتی کائے کو ہے۔ بتا تو سری کہ تو نے اُسے کدھر دیکھیو ہے......''

عورت نے چند لمحے اسے گھورا، پھر رک رک کر بولی ''سردار...... تیری گیارسی ...... ماچل سنگھ کے گھر میں ہے......''

اس کے دماغ میں بجلی کڑکی۔ اس سے بھی تیز آواز میں بادل گرجا۔ اور پھر وہ بجلی دماغ سے اتر کر سردار کے دل پر گر پڑی۔

پل کے پل میں ہی تصور میں اسے گیارسی ناگن نظر آنے لگی۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ عورت جب بدلہ لینے پر اتر آتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے۔ اس نے ماچل سنگھ کو اپنا کر اسے یعنی اپنے پتی کو ڈس لیا تھا۔ دارو پی کر یا مار پیٹ کر کے اس نے اتنا بڑا پاپ نہیں کیا تھا کہ اپنی عورت سے ڈسا جائے۔

کچھ دیر تک اس سے بولتے ہی نہیں بنا۔ پھر ہمت اکٹھی کر کے اور گلا تر کر کے وہ دھیمے سے بولا ''تو نے کب دیکھا اسے...... اور کہاں دیکھا۔؟''

''میں نے آج ہی اسے دن میں دیکھیو ہے۔ ہم لوگ ماچل سنگھ کے گھر کے باہر ٹرک سے اینٹیں اتار رہے تھے۔ اس ٹیم موئے پیاس لگی تو مالی نے پانی پینے کا جے پچھواڑے کے گھر میں بھیج دیا۔ گیارسی وہاں بچوں کے ساتھ بیٹھی تھی'' روٹی کھا رہی تھی۔ میں تھوڑا گھونگھٹ نکالے تھی اس لئے موئے وہ نہیں پہچانی۔ پن میں نے اوکو پہنچان...... اچھی موٹی ہو رئی ہے، آرام کر کر کے اور تر مال کھا کھا کے...... اور......''

رات اس نے کانٹوں کی سیج پر گزاری۔ ساری رات سویا ہی نہیں۔ ماچل سنگھ کے تصوّر نے ہی نیند اڑا دی تھی۔ ماچل سنگھ بڑا اوالا بدمعاش تھا۔ ڈاکے، اغوا اور زنا کے کیسوں میں کئی بار جیل گیا تھا۔ اس پر کیس چلے تھے مگر گواہوں کے سچ بیان نہ دینے پر ہمیشہ ہی عدالت سے بری کیا گیا۔ وہ طاقت ور تھا اور دولت مند بھی تھا اور پولیس سے ملا ہوا تھا۔ اور لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ اسے عزت سے ٹھاکر صاحب کہتے تھے۔ کوئی اس کے خلاف

جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔اس کی ایک سخت نظر ہی کسی کو برباد کردینے کے لئے کافی تھی۔وہ گونڈی پورہ سے دس میل دور سڑک کے قریب ہی اپنی کھیتی کی زمین پر تعمیر کئے گئے فارم ہاؤس میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔گیارسی کو ضرور اس نے اپنی رکھیل بنا کر پچھواڑے کے گھر میں رکھا ہوگا۔دنیا کی نظروں سے چھپا کر۔گیارسی جیسی خوبصورت عورت جو اسے نظر آجائے تو وہ چھوڑنے والا کہاں ہے۔بڑی بری موچھوں میں وہ ایک دم راکشس لگتا ہے۔جو اس سے ٹکرائے گا وہ جلد ہی اپنے انت کو پہنچ جائے گا۔یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

ویسے بھی گیارسی کے بغیر اور ایک اچھے بسے بسائے گھر کے اجڑ جانے کے بعد اس کے جیون میں اب رکھا ہی کیا ہے۔اس نے سوچا۔اس لئے وہ ضرور اس کی عورت کو اغوا کر لینے اور گھر میں قید کر لینے کی رپورٹ تھانے میں لکھائے گا اور گیارسی کو ماچل سنگھ کے گھر سے پولیس کے ذریعہ برآمد کروا کے اس پر کیس بھی چلوائے گا اس طرح جیون بھر برباد ہونے سے تو ایک دن ماچل سنگھ کے ہاتھوں مر جانا ہی اچھا۔

اس نے فیصلہ کیا اور سیدھا پولیس تھانے میں جا پہنچا اور لکھائی نامزد رپورٹ ماچل سنگھ کے خلاف۔ اور اس رپورٹ پر اس نے اپنا انگوٹھا بھی لگایا۔اور لوٹ آیا اپنے گھر، قانون کی مشنیری کو اپنا کام کرنے دینے کے لئے۔

پھر جب شام کو ایک سپاہی کے ذریعہ تھانے سے بلاوا آیا تو اسے لگا کہ اس بار کرنٹ کسی بجلی گھر سے نہیں بلکہ تھانے سے آیا ہے۔رپورٹ تو بے شک اس نے کی تھی مگر وہاں تھانے میں اس کے لئے پھولوں کا ہار نہیں ہوگا بلکہ سلاخوں کے پیچھے غصّے میں پاگل اور قہر آلود آنکھوں سے دیکھتا ہوا ماچل سنگھ ہوگا۔گیارسی قانونی طور پر بیوی تو اس کی ہے مگر اس وقت اس پر قبضہ تو ماچل سنگھ کا ہی ہے۔ماچل سنگھ کے بازوؤں سے کسی عورت کا چھین لینا کوئی آسان بات نہیں۔وہ تو سڑک پر سب کے سامنے بھی خون خرابہ کرنے سے نہیں چوکتا۔

لیکن ٹھیک ہے، وہ ظالم اس کی جان ہی تو لے گا، اس سے زیادہ تو کچھ اور نہیں کرے گا۔گھر کی عورت کی جدائی کے دُکھ سے بڑا دکھ موت نہیں ہوگی—اب اگر گھر ہمیشہ کو برباد ہو رہا ہے تو اس کا مر جانا ہی ٹھیک ہے۔گیارسی ماچل سنگھ کے ساتھ مزے اڑاتی ہو تو اڑائے۔لیکن اس کی تھوڑی بدنامی بھی تو ہو۔سماج اس پر تھوکے تو سہی۔میں مر جاؤں گا تو

اپنی ایک کہانی تو چھوڑ جاؤں گا جسے گاؤں کے لوگ برسوں یاد رکھیں گے۔ اپنا سینہ مضبوط رکھو، اب ٹکر ایک خطرناک بدمعاش سے ہے......

دنیا بھر کی ہمت اکٹھی کر کے وہ تھانے پہنچا تو امید کے مطابق ماچل سنگھ کو تھانے پر ہی پایا۔ لیکن اس طرح نہیں کہ جیسا اس نے سوچا تھا۔ ماچل سنگھ حوالات میں بند نہیں تھا۔ اور نہ قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بلکہ وہ تھانیدار کی ٹیبل کے بازو میں رکھی ایک کرسی پر بے فکری سے بیٹھا ہوا اپنی ایک مونچھ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی مسکرا پڑا تھا۔ قریب ہی گیارسی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھی تھی اور تھوڑا گھونگھٹ بھی نکالے ہوئے تھے۔ وہ ایک اچھی پھولدار ساڑی میں تھی اور اس کی کلائیاں بہت اجلی تھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ ماچل سنگھ کے گھر کی رہائش کے دوران اس نے کام کاج تو کوئی کیا ہی نہ ہوگا۔ اور اپنے بدن کی صفائی پر پورا دھیان دیا ہوگا۔ ایک رانی بنا کر رکھا ہوگا ماچل سنگھ نے اسے۔

''آؤ بھئی سردار...... تمہارا بہت دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔ تھانیدار نے کہا اور سردار کو دیوار سے لگی بنچ پر بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ ''تمہاری عورت کو ہم نے تمہاری رپورٹ پر ماچل سنگھ کے گھر سے برآمد کر لیا ہے۔''

برآمد کر لیا ہے تو پھر ماچل سنگھ کو حوالات میں بند کیوں نہیں کیا؟

اتنی عزت کے ساتھ اسے کرسی پر کیوں بٹھا رکھا ہے۔ یہ الفاظ اس نے دل ہی دل میں کہہ لئے، زبان تک نہیں آئے۔ خوف کی رسیوں نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

''تمہاری عورت کا بیان سن لو، وہ کیا کہتی ہے۔''

تھانیدار نے ہی آگے بات کی۔

''کیا کہت ہے مالک؟'' سردار کی خوف زدہ زبان میں حرکت ہوئی۔

''وہ کہتی ہے کہ ماچل سنگھ نے اسے زبردستی سے نہیں رکھا۔ بلکہ وہ ماچل سنگھ کے گھر نوکری کرتی ہے اور ان سے ہر ماہ تنخواہ پاتی ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے'' وہ بولا۔

''یہ سچ ہے'' ماچل سنگھ نے کچھ تنک کر کہا ''پوچھ لے خود اس سے۔''

''کیوں گیارسی، تیرا کیا کہنا ہے، صاف صاف بتادے۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد گیارسی نے آہستہ سے کہا''میں اپنی مرضی سے ٹھاکر صاحب کے گھر نوکری کرت ہوں، ان کی مجھ پر کوئی جور جبردستی نہیں۔''

اور بس معاملہ ختم۔ وہ بدمعاش ماچل سنگھ گیارسی کا کچھ نہ ہوکر بھی جیت گیا تھا۔ اور سردار گیارسی کا سب کچھ ہوکر بھی ہار گیا۔ اب گیارسی ہمیشہ ماچل سنگھ کی ہوکر رہے گی، عیش کرے گی اور وہ جلتا رہے گا۔ اور برباد ہو جائے گا۔

اپنی بربادی پر یکایک اس کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ دشمنوں کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر رونے جیسی تھوڑی آواز تو نکل ہی گئی۔ اس نے گرتے سے آنسو پونچھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تھانیدار نے اسے روکا۔ مگر پھر وہ وہاں ایک پل بھی نہیں ٹھہرا اور تھانے سے باہر نکل آیا۔ جب ڈاکو چھیننے پر آتا ہے تو سب برباد کر جاتا ہے اور اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آج وہ بھی ایک ڈاکو کے ذریعہ لوٹا گیا تھا۔

وہ اپنے گاؤں لوٹ آیا تھا اور اپنے گھر بھی آ گیا تھا۔ مگر اب اس کے لئے وہاں کیا رکھا تھا۔ اس کی عورت اپنا آدمی اور اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک غنڈے کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اور غنڈے کے ساتھ رہ کر اسے سزا دے رہی ہے۔ اور سزا بھی اس طرح کہ اپنا شریر اس کے حوالے کر رہی ہے۔ اور وہ غنڈہ دل کھول کر اس کی پتنی کو...... روزانہ...... اُف......!

یہ خیال آتے ہی وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیتا اور دل مسوس لیتا اور پھر بہت رنجیدہ ہو جاتا۔ ایسے حالات میں وہ اپنی جان تو نہیں دے گا مگر یہ گھر اور یہ گاؤں اب ضرور چھوڑ دے گا۔

دوسرے ہی دن وہ گاؤں چھوڑ کر جانے ہی والا تھا کہ ماچل سنگھ کا بلاوا آ گیا۔ اس کے پاس وہاں جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ایک طاقت ور غنڈہ تھا اور آج کی دنیا میں سماج کے کچھ لوگوں پر غنڈوں کی بھی حکومت چلتی ہے۔

اسے ماچل سنگھ نے گھر کے اندر بلا لیا تھا۔ پچھواڑے کے گھر کے اندر۔ اسے لگا کہ گھر کے اندر جو وہ آ گیا ہے تو اب شاید ہی کبھی اس گھر سے زندہ واپس نکل سکے۔ سامنے دالان میں تین صوفوں پر کئی لوگ بیٹھے تھے۔ ماچل سنگھ، اس کی پتنی ٹھکرائن، گاؤں کا سرپنچ

اور...... گیارسی۔ اور قریب ہی ایک چوکی پر گھر کی دو کرانیاں براجمان تھیں۔

سرپنچ بھی کوئی اچھا آدمی نہ تھا۔ چہرے سے ہی دوغلا اور بے ایمان نظر آتا تھا۔ اس نے کہا۔

''آجا سردار، اِدھر آ بیٹھ جا۔''

لیکن سرداران کے ساتھ نہیں بیٹھا۔ نزدیک ہی کھڑا ہو گیا اور تجسس بھری نگاہوں سے ان سب کو دیکھنے لگا۔ ایسا لگا اسے کہ جیسے وہ سب مل کر اس سے گیارسی کو تیاگ دینے کو کہیں گے اور اسے ہر طرح سے مجبور کریں گے۔ تو پھر ٹھیک ہے، ایسی دوغلی عورت اور ماچل سنگھ کی جھوٹن اب اس کے کس کام کی۔ وہ تو اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ حرام جادی...... کمینی...... رنڈی......

''اب بول تُو کیا چاہتی ہے؟'' ٹھکرائن نے گیارسی سے پوچھا۔

کچھ توقف کے بعد گیارسی نے کہا۔ ''میں واپس اپنے گھر جان چات ہوں۔ اپنے آدمی کے سنگ......''

''پن میں اب اسے اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہیں۔ اب یہ میرے کوئی کام کی نہیں'' سردار نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

''تو غلط سمجھے ہے سردار'' ٹھکرائن نے کہا ''یہ آج بھی ایسی ہی پوتر ہے کہ جیسی تیرے گھر سے آئی تھی۔ تو نے دارو پی کر اس کی مار پیٹ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پھر اس کے باپ کے سامنے ہی تھپڑ مار دیا۔ ارے عورت کی بھی عجت ہوتی ہے۔ وہ ایک سیما تک ہی آدمی کا جو جلم برداشت کر سکتی ہے اور تو نے اس سیما کو سمجھا ہی نہیں۔ بس تیری ہی غلطی تھی جسے تو آج تک بھگت رہا ہے۔ یہ تیرا گھر چھوڑ کر اپنے باپ بلدیو کے گھر چلی گئی تھی۔ وہاں باپ سے عُجت ہوئی۔ آتم ہتیا کرنے کو تیار ہو گئی پن تیرے گھر جانے کو تیار نہیں ہوئی۔ بلدیو نے میرے یہاں نوکری تھی۔ وہ مجھے سارا قصہ بتانے آیا تو ہم لوگ اپنی جیپ میں اس کے گھر گئے۔ مگر یہ بچوں کو لے کر اس دن وہاں سے جا چکی تھی۔ پتہ چلا کہ کولار ڈیم کی طرف پیدل گئی ہے۔ ہم نے پیچھا کیا تو راستے میں ہی مل گئی۔ وہاں بہت روئی، تیرے گھر جانے کو کسی بھی طرح راضی نہ ہوئی تو پھر میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس کی سُرکشا کا وعدہ

کر کے۔ پھر اور کیا کرتی۔ کیا اسے جنگل میں چھوڑ آتی؟ تب سے آج تک وہ میرے گھر کا کام کرتی ہے اور تنخواہ پاتی ہے۔ اور رات میں میری دونو کرانیوں کے ساتھ سوتی ہے۔ میرے پتی بدنام ضرور ہیں مگر اب کوئی غلط کام نہیں کرتے۔ اب وہ سدھر گئے ہیں اور دکھیاروں کی مدد کرتے ہیں اور اب اگلے الیکشن میں بھی کھڑے ہونے والے ہیں۔ ہم دونوں نے سوچا کہ تیرا دماغ جب بالکل ہی ٹھیک ہو جائے گا تب ہی اس کو تیرے پاس بھیجیں گے اور اب وہ سمے آ گیا ہے۔ لیکن دیکھ اب اسے کبھی تنگ مت کرنا۔ ہاتھ بھی مت لگانا اسے۔ اور اگر دارو بھی مت پینا۔ اور گر پئے گا تو پھر میرے ماچل سنگھ کا دماگ خراب ہو جائے گا۔ جا لے جا اسے......"

گیارسی کا چہرہ اس وقت گھونگھٹ سے عاری تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اور پاس ہی بیٹھی دونوں ملازمین عورتیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ اور ماچل سنگھ بھی۔ اور خاص بات یہ تھی کہ گیارسی کے چہرے پر اپنے پتی کی وفاداری کے رنگ سارے کے سارے موجود تھے۔

سردار نے ٹھکرائن کو بے حد تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بڑھ آگے پھر کر ٹھکرائن کے چرن چھو لئے!!

کہانی ایک ہیروئن کی

پتہ نہیں کیسے، مگر ممبئی کے کالجوں میں پڑھنے والی غیر معمولی خوبصورت لڑکیوں کی خوبصورتی کا پتہ کسی نہ کسی ذریعہ سے کچھ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو چل ہی جاتا ہے۔

سینٹ زیویئر کالج کے ریسٹورینٹ میں چائے پیتے پیتے پرتیبھا ناڈکرنی کی سہیلی مونیلا نے پرتیبھا سے کہا۔

''بول، کیا تو فلم میں کام کرنا پسند کرے گی۔ کسی نے تیری خوبصورتی اور تیرے کالج کے ڈرامے کے اچھے کام کے بارے میں میرے آنند بھیا کو بتایا تھا۔ اگر تو اسکرین ٹیسٹ میں کامیاب ہوگئی تو وہ تجھے اپنی اگلی فلم کی ہیروئن بنادیں گے۔''

پرتیبھا کو یقین نہیں آیا۔ ہنستے ہوئے بولی'' کیوں، ایسا مذاق کرنے کو میں ہی ملی تھی تجھے۔ کالج کے پانچ سات ڈراموں میں ہی تو کام کیا ہے۔ مجھے تو کیمرے کا ذرا بھی تجربہ نہیں۔ میری جیسی اناڑی لڑکی کو لے کر کیا انہیں اپنی فلم کا اور لاکھوں کروڑوں کا کباڑا کرانا ہے؟''

مونیلا نے اپنے گلے کی چٹکی لے کر کہا'' میں جھوٹ بولوں تو مرجاؤں پرتیبھا، وہ سچ مچ تجھے اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں۔ وہ ڈراموں کی اچھی لڑکیوں کو فلم کے لائق بنا لیتے ہیں اور پھر خود مجھ سے انہوں نے تیرے سے پوچھنے کے لئے کہا ہے۔'' پرتیبھا کو کچھ عجیب سا لگا۔ وہ تو ایم اے پاس کر لینے کے بعد آگے تعلیم جاری نہ رکھ کر کہیں نوکری کا پلان بنا رہی تھی، کیونکہ اس کے پتا گوپال ناڈکرنی جو کہ ڈاک یارڈ میں واقع فوڈ کارپوریشن کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ ہیں، اب چند ماہ بعد ہی ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ان کی تین بیٹیوں میں پرتیبھا

ہی سب سے بڑی ہے۔اس لئے پتاجی کے ریٹائر ہو جانے کے بعد اب اسے ہی گھر کا بار اٹھانا ہے۔ ممبئی میں نوکریوں کی بہت قلت ہے اس لئے وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوا کرتی کہ اتنے بڑے شہر میں عزت کی اور قاعدے کی نوکری وہ کس طرح پا سکے گی۔ لیکن مونیلا کی بات سے تو قسمت اس پر مہربان نظر آتی تھی۔ جو کچھ مونیلا کہہ رہی ہے اگر وہ سچ ہوا تو ایشور جانے وہ کیا سے کیا بن جائے گی۔ اپنے ماں باپ اور اپنی بہنوں کو ہر قسم کا سکھ دے گی۔اس نے ایک بار پھر مونیلا کو ٹٹولا۔

''لیکن میں اتنی خوبصورت کہاں ہوں مونیلا، میں نے کالج میں کچھ ڈرامے ہی تو کئے ہیں۔ مجھ سے کئی گنا اچھی لڑکیاں اس بمبئی میں پڑی ہیں۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔'' مونیلا نے اس کے گورے گورے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور پھر بہت پیار سے بولی ''تو کیا جانے پگلی کہ خوبصورتی کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ صرف گوری رنگت سے ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک خاص کشش سے ہوتی ہے جو تیرے اندر ہے۔ پھر تیرا قد بھی اچھا ہے۔ میری نظر میں بھی تو ہیروئن بننے کے لائق ہے۔ تیری خوبصورتی اور تیرے ڈراموں کے کارن ہی تو کالج کے لڑکے تجھ پہ مرتے ہیں۔''

پرتیبھا مبہوت سی چند لمحے اپنی سہیلی کو دیکھتی رہی، لیکن پھر جلد ہی بولی ''لیکن میرے پتاجی کو یہ لائن پسند نہیں اور وہ فلم والوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ تو کبھی فلم تک نہیں دیکھتے اور ان کی مرضی کے بغیر میں حامی نہیں بھر سکتی۔''

''وہ تو مجھ پر چھوڑ۔ میں اور بھیا ان سے بات کرلیں گے اور انہیں راضی کرلیں گے''۔

''مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ راضی ہو جائیں گے۔ پھر بھی تم لوگ بات کر کے دیکھو''۔

''لیکن پہلے تیرا اسکرین ٹیسٹ تو ہو جائے''۔

''اس کے لئے میں تیار ہوں۔''

پرتیبھا لیمنگٹن روڈ کی ایک خستہ حال بلڈنگ میں رہتی تھی اور مونیلا دادر کے مسانی روڈ پر کہ جہاں پرتھوی راج کپور کے زمانے سے بہت سے فلمی لوگ رہتے آرہے ہیں۔ وہاں کے فلمی ماحول سے متاثر ہو کر مونیلا کا بھائی آنند پرب پہلے معاون ہدایت کار

اور پھر ہدایت کار اور ایک دوست کی شرکت میں معاون فلم ساز بن گیا تھا اور اپنی فلموں میں نئے خوبصورت چہرے متعارف کراتا تھا۔ پرتیبھا کو ایک پارٹی میں دیکھا تو اسے لگا کہ تراش خراش کر اسے ایک اچھی ایکٹریس بنایا جاسکتا ہے۔ پرتیبھا میں اسے مستقبل کی ایک اچھی ہیروئن نظر آنے لگی۔ اور اچھی بات تو یہی تھی کہ وہ اس کی بہن کی سہیلی نکلی۔

دو روز بعد ہی جب دونوں سہیلیاں کالج سے سیدھے اندھیری کے نٹ راج اسٹوڈیو پہنچ گئیں تو آنند نے بہت گرمجوشی سے پرتیبھا کا استقبال کیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد ہی اس کا اسکرین ٹیسٹ اور آواز کا آڈیشن کرایا۔ اس کے ساتھیوں نے آنند کو مبارکباد دی کہ اس نے اسکرین کے لئے ایک اچھا چہرہ دریافت کیا ہے۔

لیکن اب مسئلہ پرتیبھا کے والد کو راضی کرنے کا تھا۔ تو ایک صبح آنند مونیلا کو ساتھ لے کر پرتیبھا کے گھر پہنچ گیا اور اس کے والد گوپال ناڈکرنی سے اپنا مدعا بیان کیا اور کہا کہ ان کی بیٹی ان کے دن پھیر سکتی ہے کیونکہ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی اچھی فنکار ہے اور اگر وہ ایکٹریس بن گئی تو ضرور کامیاب ہوگی۔ لیکن ناڈکرنی کچھ برہم ہوکر آنند سے بولے۔

"ہم لوگ بہت چھوٹے ہیں لیکن تھوڑی بہت عزت رکھتے ہیں اور فلم لائن میں عورتوں کی عزت کہاں بچتی ہے، یہ تم بھی سمجھتے ہو، ہمیں دھن کا موہ نہیں ہے، ہم تو اسی حال میں خوش ہیں"

"لیکن انڈسٹری میں اب وہ پرانا ماحول نہیں رہا ناڈکرنی جی۔ آج اچھے گھرانوں کی لڑکیاں عزت سے فلموں میں کام کرتی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں، پرتیبھا میری بہن کی سہیلی ہے، اس کی عزت پر آنچ نہیں آئے گی"۔

"لیکن ہمیں تو معاف کیجئے آنند بابو، ہم اپنی لڑکی کو فلم میں نہیں بھیجیں گے۔"

آنند مایوس ہوگیا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری "کوئی جلدی نہیں ناڈکرنی جی، آپ لوگ اچھی طرح سوچ سمجھ لیجئے گا۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ میں پرتیبھا کو اپنی فلم کے لئے دس لاکھ میں سائن کرنے کو تیار ہوں اور دو لاکھ ایڈوانس بھی دیا جاسکتا ہے۔ آدھی فلم بن جانے اور دو تین علاقے بکنے کے بعد اسے کار بھی دلائی جاسکتی ہے۔ تب تک اسے

لینے کمپنی کی کار آئے گی.........''

''ہمیں کچھ نہیں چاہئے...... ہمیں تو اپنے گھر کی عزت پیاری ہے۔ ہمیں معاف ہی کیجئے آنند بابو''۔

''دیکھئے...... پرتیبھا کی ماں نے آنند سے پوچھا'' شوٹنگ پر ہر جگہ اس کی ماں تو ساتھ جاسکتی ہے نا؟''

''تیرے کو لالچ آرہا ہے'' ناڈکرنی نے سخت نگاہوں سے بیوی کو دیکھا، پھر بولے'' مگر میں اپنی بیٹی کو فلم لائن میں نہیں جانے دوں گا، یہ تو اچھی طرح سمجھ لے''

''بیٹی میری بھی ہے، میں اس کا برا نہیں چاہوں گی۔ اگر فلم لائن کا ماحول اچھا دیکھوں گی تبھی اجازت دوں گی ورنہ نہیں۔ آپ جایئے آنند بابو، ہم لوگ سوچ سمجھ کر جواب دیں گے۔''

کوئی ایک ہفتے تک گھر میں اس موضوع پر مراٹھی میں گرما گرم بات چیت ہوتی رہی، ناڈکرنی کے دماغ کا پارہ ایک ہفتے تک گرم رہا مگر بالآخر بیوی کے آگے ناڈکرنی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ آنند کی کار آتی اور دونوں ماں بیٹی کو چند گھنٹوں کے لئے کبھی اسٹوڈیو تو کبھی آنند کے گھر لے جاتی۔ آنند اپنی ہدایت میں پرتیبھا کو کیمرے کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دونوں ماں بیٹی آنند کے اخلاق سے متاثر ہوکر بہت خوش خوش گھر لوٹتیں۔ ہر روز ان کا جھکاؤ فلم کے کام کی طرف ہوتا جارہا تھا۔ اور پھر ایک دن پرتیبھا کی ماں دولاکھ روپے کا چیک لے کر گھر آگئی اور آتے ہی اس نے اپنے شوہر کو وہ چیک دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دولاکھ روپیہ کبھی تم ایک بار بھی گھر نہیں لائے۔ آج اپنی بیٹی لے آئی ہے...... دیکھو، اچھی طرح دیکھو، یہ دولاکھ روپے کا چیک ہے، تم اسے کل ہی کیش کرا سکتے ہو۔''

''اس دولاکھ کے بدلے کیا جائے گا، یہ تو نہیں سمجھ سکے گی۔ یہ لوگ بہت چالباز ہوتے ہیں، دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں......''

''وہم ہے یہ تمہارا۔ کیونکہ تم پرانے اور دقیانوسی آدمی ہو۔ ساری دنیا تمہیں خراب ہی نظر آتی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے، آج کل اچھے اچھے گھروں کی لڑکیاں فلموں میں کام کر رہی ہیں۔ وہ راجکپور کی پوتی بھی تو ہے۔''

''وہ تو سب فلمی لوگ ہیں''۔

''تو کیا فلمی لوگ عزت نہیں رکھتے؟''

ناڈکرنی طنزیہ ہنسی ہنس دیئے، پھر بولے'' مجھے معلوم ہے کہ کوئی کیا ہے۔ جہاں شراب کی ریل پیل ہواور ساتھ میں بے شرمی بھی ہو تو وہاں کسی عزت کتنے دن قائم رہ سکتی ہے بھلا۔ ان کی عزت کا پیمانہ کچھ دوسرا ہی ہے''

''میری بیٹی کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گی''۔

ناڈکرنی پھر ہنسے اور بولے'' وہ بھی مجھے معلوم ہے''۔

اگلے کچھ دنوں میں پرتیبھا کی ماں نے بازار جا جا کر چیک کے روپیوں میں سے کئی ہزار خرچ کر دیئے۔ ماں کو خوش دیکھ کر بیٹی بھی خوش ہوتی تھی مگر ناڈکرنی اسے دیکھ کر ناک بھوں ہی سکیڑتے تھے۔

قریب چار ماہ بعد ہی آنند نے اپنی نئی فلم'' دل دل سے ملا کر دیکھو'' پر کام کرنا شروع کر دیا۔ پرتیبھا کو اس کا رول بتا دیا گیا تھا۔ اس لئے وہ ریہرسل وغیرہ کے لئے بہت مصروف ہو گئی تھی۔ اور پھر جلدی ہی فلم کی مہورت کا دن بھی آ گیا۔ اس کا رنگ روپ نکھارنے یعنی اسے مزید خوبصورت بنانے کے لئے اسٹوڈیو کے بہت سے لوگ اس دن اس کے آگے پیچھے دوڑنے لگے تھے۔ میک اپ مین ایک طرف سے اس کے چہرے کے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہا ہے تو دوسرے جانب سے ہیئر ڈریسر اس کے بالوں میں پن لگا رہی ہے۔

بطور فلم کی نئی ہیروئن اسے مہمانوں سے متعارف کرایا گیا۔ بہت خوشی اور فخر کے ساتھ آنند اس کا تعارف مہمانوں سے کراتا تھا۔ وہ بھی بہت خوش تھی کیونکہ ایک تو فلم انڈسٹری کی معروف ہستیاں وہاں موجود تھیں، دوسرے سبھی کی نگاہیں اس پر موکوز تھیں اور سبھی نے انڈسٹری میں اس کا استقبال گرمجوشی سے کیا تھا۔ معروف ہیرو سلمان خان نے اپنی کرسی اس کے قریب لا کر اور مسکرا کر اس کے کان میں کہا'' تم تو پٹاخہ ہو یار، ایک دم پٹاخہ، تم بہت جلدی لوگوں کی نیندیں اڑانے والی ہو۔ مجھ سے دوستی کرو گی۔؟'' اور وہ بس مسکرا پڑی تھی۔ ایک دیگر مشہور پروڈیوسر بھی اسے اپنی اگلی فلم میں لینے کو تیار ہو گیا تھا کہ جس کی زیادہ شوٹنگ یورپ اور امریکہ میں ہونا تھی۔ اب تو بس قسمت ہی اس پر مہربان لگ رہی تھی۔

گھر آ کر جب اس کی ماں نے اس کے پتاجی کو نئی فلم اوراس کی امریکہ میں شوٹنگ کے بارے میں بتایا تو ہمیشہ کی طرح وہ پھر طنزیہ ہنسی ہنس دیئے۔اور مراٹھی میں بولے''ابجت چے آتا موٹھے موٹھے سوداہوت آہے''(عزت کے اب بڑے بڑے سودے ہونے والے ہیں۔)

مہورت کے بعد فلمی رسائل اوراخبارات میں اس کی پبلٹی بڑے پیمانے پر شروع کردی گئی۔ساتھ ہی اسے اوراس کے گھر والوں کو ورسورا کے ایک فلیٹ میں پہنچا دیا گیا تھا۔اوراب ناڈ کرنی پر توجہ دینے یا اہم معاملوں میں بھی ان سے کچھ پوچھنے کی بھی فرصت کس کو تھی۔گھر کے سبھی لوگ نئے نئے مشاغل میں مصروف ہو گئے تھےاور...... سچ تو یہ ہے کہ ناڈرکرنی بھی اب اپنے نئے نئے سوٹ کا کپڑا پسند کرنے ،ان کوسلوانے اور پارٹیوں میں شرکت کرنے میں اور نئے نئے امیر لوگوں کو دوست بنانے میں مصروف رہنے لگے تھے۔اور پارٹیوں میں نیا نیا کوئی دوست جام ان کے قریب ہی لے آئے تو وہ کہاں تک انکار کرتے۔وہ ہنس دیتے تھے لیکن نانہیں کر سکتے تھے۔ نئے ماحول کااورامیروں کی امیری کا رنگ ان پر چڑھنے لگا تھا۔ایسا لگتا تھا نہیں کہ جیسے اب وہ زمین سے کچھ اوپر اڑنے لگے ہیں۔بیٹی اب اتنی بری نہیں لگتی تھی۔اس کے معاملے میں ان کواطمینان اس بات سے تھا کہ اس کی ماں تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔آخر کوئی ماں اپنی بیٹی کا برا کب چاہے گی بھلا۔

لیکن ماں بس شوٹنگ تک ہی اس کے ساتھ جاتی تھی۔پارٹیوں میں اس کے بجائے اس کا بھائی یعنی پرتیبھا کا ماما ستیش پرتیبھا کے ساتھ جاتا تھا۔لیکن پرتیبھا کا اوراس کے ماما ستیش کا ساتھ پارٹی کے ہال میں داخل ہونے تک ہی رہتا تھا۔ہال کے اندر جیسے ہی آنند بابو یا کوئی مشہور ہیرو پرتیبھا کا استقبال کرنے کوآگے بڑھتے تو پھر ستیش پیچھے رہ جاتا تھا۔بے بی کے پیچھے زیادہ نہیں لگنا چاہیے ،وہ سوچتا۔وہ خود پھر ہال میں اس جانب آگے بڑھ جاتا کہ جہاں دو چار لڑکیاں ہنسی مذاق میں مصروف ہوتیں۔اسے معلوم تھا کہ اس لائن کی لڑکیاں جلد ہی دوست بن جاتی ہیں۔

اور پھر جب ستیش ان کے ساتھ ہو جاتا تو اسے خبر ہی نہ ہوتی کہ پرتیبھا کس کے ساتھ ہےاورکس حال میں ہے۔کئی لوگ آگے بڑھ کر پرتیبھا سے اپنا تعارف کراتے تھے مگر

آنند بہت گھاگ تھا جو دو چار منٹ سے زیادہ کسی کو بھی پرتیبھا کے پاس نہیں ٹھہرنے دیتا تھا۔ پرتیبھا کے قریب آنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ فلموں میں پیسہ لگانے والے اور فلمیں بنانے والے لوگ تھے۔ اس نے ان میں سے کسی کو بھی پرتیبھا کو ٹچ بھی نہیں کرنے دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ پرتیبھا پر اگر کسی مرد کا کوئی حق ہے تو وہ خود اس کا ہے۔ پرتیبھا اس کی پراپرٹی ہے جس کا استعمال ایک دن وہ خود کرے گا۔ ابھی تو بس وہ یہی چاہتا تھا کہ پارٹیوں کے ذریعہ پرتیبھا شہرت حاصل کرتی جائے اور اس کا ذہن کچھ ایسا ہو جائے کہ وہ شراب اور سیکس کو معیوب نہ سمجھے۔

آنند تجربہ کار تھا۔ اس نے پرتیبھا کے ذہن کی تبدیلی کے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اتنا تو ہوا کہ وہ پارٹیوں میں اب شراب پی لیتی تھی اور واپسی میں کار تک آتے آتے یا تو آنند کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی یا اس سے سٹ کر چلنے لگی تھی۔ یعنی لوہا گرم ہو چکا تھا اور اب بس ہتھوڑا مارنے کی ہی دیر تھی۔

ایک شام۔ آنند نے پرتیبھا اور اس کے ماما ستیش کو کسی پارٹی میں شرکت کرنے کے لئے پہلے اپنے فلیٹ واقع کھار میں بلایا کہ جو عیش وعشرت کے لئے ہی وقف تھا۔ وہ دونوں جب اندر آئے تو آنند نے پرتیبھا کو ڈرائنگ روم کے صوفے پر بٹھایا اور خود ستیش کو ایک دیگر کمرے میں لے گیا اور وہاں پہلے سے ہی بیٹھی ہوئی کرسٹینا نام کی ایک پرکشش عیسائی لڑکی سے اسے متعارف کرایا۔ اور پھر کار کی چابی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ اُسے ابھی پرتیبھا اور دیگر لوگوں کے ساتھ فلم کے کچھ سین ڈسکس کرنا ہے، اس لئے وہ کرسٹینا کو لے کر تاج محل ہوٹل جائے اور وہاں کی پارٹی میں شرکت کر آئے اور وہاں میزبانوں سے اس کی طرف سے معذرت کر لے۔

ایک کار، ایک لڑکی اور تاج محل ہوٹل۔ لیکن پیسہ؟ وہ تو ہے نہیں۔ اس کی ساری جیبیں خالی تھیں۔ یہ سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی یہ پریشانی کچھ زیادہ دیر نہیں رہی، کیونکہ جلد ہی آنند بابو نے کسی الماری سے لا کر پانچ پانچ سو روپیوں کی ایک خاصی وزنی گڈی اس کے ہاتھ میں تھما دی اور مسکرا کر بولے "جاؤ عیش کرو، ہیروئن کے ماما کو بھی عیش کرنے کا حق ہے۔ یہ سارے خرچے بھی ہم اٹھاتے ہیں۔"

ستیش احمق نہیں تھا، جو یہ نہ سمجھتا کہ آج آنند بابو کی نیت ٹھیک نہیں۔ اسے ٹرخانے کے لئے ہی وہ یہ سب کر رہے ہیں۔ لیکن ٹھیک ہے، اس لائن میں کوئی لڑکی آخر کب تک بچی رہ سکتی ہے۔ ایک نہ ایک دن تو اسے اپنی عزت دینا ہی ہے۔ اور پھر آنند بابو کا تو اس پر حق بھی ہے۔ آنند بابو خوش رہیں گے تو وہ اور بھی ترقی کرے گی۔ اور وہ ترقی کرے گی تو پیسہ زیادہ آئے گا۔ اور پیسہ زیادہ آئے گا تو وہ بھی عیش کرے گا۔ اس لئے وہی کرو جو آنند بابو کہتے ہیں۔ یہاں سے پھوٹ چلو۔ کرسٹینا کی کمر میں ہاتھ ڈالو اور اسے لے کر عیش کی دنیا میں چلے جاؤ۔ تاج محل ہوٹل، کرسٹینا، بند کمرہ اور کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والا سمندر۔ کیا زندگی میں اس طرح بھی خوابوں کے رنگ بھر جاتے ہیں۔ وہ چلا گیا۔

آنند بابو کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ کیونکہ ستیش چار پانچ گھنٹوں کے لئے رخصت ہو چکا تھا۔ اور اب اس کے فلیٹ میں پرتیبھا تن تنہا تھی جو آرام دہ صوفے پر بیٹھی ہوئی ایک غیر ملکی انگریزی رسالے کے اوراق اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ آنند نے ڈرنک بنائی اور ایک گلاس پرتیبھا کی طرف مسکرا کر بڑھا دیا۔

''ابھی سے'' پرتیبھا بھی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ مسکرائی اس لئے کہ وہ بھی اپنے پروڈیوسر ڈائریکٹر کو خوش دیکھنا چاہتی تھی، کیونکہ اس کے باعث ہی تو وہ ایک معمولی لڑکی سے شہزادی بن سکی تھی۔ اور آنند ہی تو وہ علاؤالدین تھا جس نے چراغ گھس کر اسے خوابوں کی شہزادی بنا دیا تھا۔ ''یہ سب تو پارٹی میں اچھا لگے گا۔ سب لوگوں کے ساتھ''۔ اس نے آگے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ پارٹی میں جانے سے پہلے ہی کچھ موڈ بن جائے۔ میں ہمیشہ ہی ایسا کرتا ہوں، کیونکہ اچھا موڈ بن جاتا ہے تو پارٹی میں بھی بہت لطف آتا ہے۔'

اس بات پر بھی اس نے پرتیبھا کو مسکراتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اسکاچ وہسکی کا گلاس خود آنند ہی نے پرتیبھا کے منہ سے لگا دیا۔ جو گلاس اس کے منہ تک آیا تھا وہ ایک رہنما اور محسن کا گلاس تھا۔ اور پھر اس سے جو رشتہ بنا وہ بھروسے کا تھا۔ اس لئے اس نے اسے مسکراتے مسکراتے پی لیا۔

اسکاچ وہسکی اگرچہ ایک اچھی ولایتی شراب تھی مگر کچھ کڑواہٹ تو اس میں بھی تھی۔ کڑواہٹ سے اسے پھریری آئی تو آنند نے مسالے والے کا جو بھی اسے اپنے ہاتھ

سے کھلا دیئے۔ کبھی شراب کا گھونٹ تو کبھی مسالے والے کاجو۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک چلا۔ اور جب ایسے سلسلے دیر تک چلتے ہیں تو کچھ نشہ ہو ہی جاتا ہے۔ پرتیبھا کو بھی خاصہ نشہ ہو گیا تھا۔ اور جب نشہ خوب ہوا تو اس کا موڈ کھل اٹھا۔ جیسے سارا وجود ہی مسکرا پڑا۔ مستی میں اس کے ہاتھ آنند کی کلائیوں سے اور آنند کی کلائیاں اس کی کلائیوں سے ٹکرانے لگیں۔

آنند اب اس کے کچھ اور نزدیک آ گیا۔ اتنا کہ اس کا ایک گال پرتیبھا کے گورے اور خوبصورت گال سے ٹکرانے لگا تھا۔ پرتیبھا کے چہرے پر اعتراض کے کوئی تاثرات اب بھی نہیں آئے تھے۔ اور ایسے لمحوں میں یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایک بھرپور جوانی اور خوبصورتی کا خزانہ اب اس کے ہاتھ لگنے ہی والا تھا۔ مستقبل قریب میں سارے زمانے میں دھوم مچانے والی ہیروئن آج اس کے بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کا باعث ہوگی۔ آج وہ اس کی ہوگی۔ ساری کی ساری۔

اور پھر اس نے مزید کوئی تاخیر کیے بغیر پرتیبھا کو لپٹا لیا۔ وہ کسمسائی۔ آنند یہ کیا کر رہا تھا۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ مگر آنند نے اسے چھوڑا ہی نہیں اور پھر اس نے دیکھا کہ اس کا خود کا جسم بغاوت پر آمادہ ہے اور آنند سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔ وہ جل رہا ہے۔ شراب نے اس کے اندر شعلے بھڑکا دیئے ہیں۔ آنند نے کچھ اور ہمت کی اور اس کے بریزئیر کے ہکس چھونے لگا۔ دماغ نے احتجاج میں چیخنا چاہا مگر جسم کی ترنگوں نے اس چیخ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور تبھی اسے اپنی ماں کا اور پھر اپنے باپ کا خیال آ گیا۔ باپ جہاندیدہ اور ہوشیار تھے جو اپنی بیٹی کی آبرو کو داؤ پر لگنے کا خطرہ بہت پہلے دیکھ چکے تھے۔ اور ماں تو ایک دم سادہ لوح تھی جو دنیا کے لوگوں کی فطرت کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ اس کی ناسمجھی کے باعث ہی تو آج اس کی بیٹی کی عزت ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے اور وہ گناہوں کی دنیا میں دھکیلی جا رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ باپ کے مقابلے میں ماں اپنے بچوں سے زیادہ محبت کرتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ باپ شاید اس سے بھی زیادہ اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے۔ اس معاملے میں ہی دیکھو، اس کے پتا جی ساری عیش و عشرت کو ٹھکرانے کو تیار تھے لیکن ماں نے دوڑ کر اپنی بیٹی کی عزت کا اپنے عیش و عشرت سے سودا کر لیا۔

آنند آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی گستاخیوں سے اس کے جسم کو تو لطف آ رہا تھا مگر نشے کے باوجود اس کے دل و دماغ میں ایک تکلیف دہ احساس بھی اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ کہ اب اس کی بیش قیمت چیز ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہونے والی ہے۔ یہ اچھا نہیں ......ایک عزت دار گھرانے کی عزت دار لڑکی کے لئے یہ بالکل بھی اچھا نہیں۔ کیا اسے اب بھی اپنی عزت و عصمت بچالینا چاہئے۔ لیکن اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ اگر پُر زور مزاحمت کرے بھی تو آنند اب باز آنے والا نہیں۔ وہ تنہائی میں اس پر قابو پا چکا ہے اور یہاں آس پاس کوئی ایسا نہیں جو اس کی حفاظت کے لئے دوڑا دوڑا آئے۔ یہ عمارت ایک ایسا حمام ہے جہاں سبھی عریاں ہیں۔ یہاں کے کسی فلیٹ میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس سے دوسرے کسی فلیٹ والے کو کوئی سروکار نہیں، یہ وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ آج اس کی حفاظت کے لئے کوئی نہیں آئے گا۔ وہ آنند کے سنہری جال میں پھنس چکی ہے۔ فلم لائن کے کئی راونوں میں آنند بھی ایک راون ہی ہے۔ بلکہ سیتا کا ہرن کرنے والے راون کے مقابلے میں آج کے راون کچھ زیادہ ہی چالاک، ہوشیار اور ظالم ہیں۔

جتنا جتنا آنند اس کے جسم کو نوچ رہا تھا اتنی ہی اس کی آنکھیں نم ہوتی جا رہی تھیں اور اندر اندر کہیں اس کا دل بھی رو رہا تھا۔ اگر پہلے اس میں سمجھ ہوتی تو اپنی عزت و عصمت کی خاطر وہ کروڑ وروپے ٹھکرا سکتی تھی اور فلم لائن کی شہزادی بننا کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اس وقت وہ کتنی نادان تھی۔ یہ ماں کا کام تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی حفاظت کا سوچ کر اسے اس لائن میں آنے ہی نہ دیتی، مگر وہ بھی نادان ہی تھی، کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔ یا شاید دور سے نظر آنے والی عیش و عشرت کی زندگی نے اس کی آنکھوں کو چوندھیا دیا۔ کاش کہ ماں میں عقل ہوتی۔

اور...... بالآخر......وہ برباد ہوگئی۔ اس کی بیش قیمت چیز اس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ وہ دلہن نہ بن سکی اور اس کے سارے کنوارے ارمان لوٹ لئے گئے۔ بہت دیر سے پتہ چلا کہ آنند اچھا آدمی نہیں تھا۔ وہ بھی ایک شیطان ہی ثابت ہوا۔

مدہوشی اور صدمے کے درمیان ہی اسے نیند نے آگھیرا۔ اور جب ستیش نے اسے سوتے میں سے جھنجھوڑا اور اس نے کھڑے ہو کر اور ساڑی درست کرتے ہوئے گھڑی دیکھی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ آنند دوسرے کمرے میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کی پرواہ

کئے بغیر سٹیشن کے ساتھ وہ لفٹ سے نیچے گئی جہاں کار کا ڈرائیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کار میں وہ بیٹھی تو آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ شراب اس کے اعصاب پر اب بھی چھائی ہوئی تھی۔

وہ دونوں فلیٹ پر پہنچے تو ماں نے ہی دروازہ کھولا۔ لیکن وہ ماں سے کوئی بات کئے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آج پہلی بار ماں اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اگر ماں اجازت نہ دیتی تو وہ کیوں آزادی اور بے حیائی کی دنیا میں جاتی۔

اُدھر ماں نے بھی پرتیبھا کے لٹے لٹے چہرے اور ابتر حالت دیکھ کر ایک ہی نظر میں جان لیا تھا کہ اب وہ پاکیزہ نہیں رہی۔ دل کو کچھ صدمہ سا ہوا مگر پھر سوچا کہ ایسا تو کبھی نہ کبھی ہونا ہی تھا۔ دھیرے دھیرے وہ یہ سمجھ چکی تھی کہ دولت اور شہرت کی قیمت کبھی نہ کبھی تو چکانا ہی تھا۔ لیکن جس سوسائٹی میں وہ اب رہتے ہیں وہاں ان کو نام رکھنے والا کون ہے۔ بے شک پرتیبھا کے ساتھ برا تو بہت ہوا لیکن یہاں اس سوسائٹی میں ان باتوں پر کون دھیان دیتا ہے۔ اس لئے اس بارے میں زیادہ سوچنا بے کار ہے۔

صبح وہ سو کر اٹھی تو اسے لگا کہ جیسے اس نے رات میں کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ کہ جس میں اس کی عصمت لوٹ لی گئی تھی۔ لیکن پھر تبھی خیال آیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ وہ سچ مچ لٹ چکی ہے۔ یہ احساس آتے ہی اس کے دل و دماغ کو بہت تکلیف ہوئی۔ اور تبھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ فلم میں کام نہیں کرے گی۔ اور یہ فیصلہ کر کے وہ پھر سو گئی۔

اس دن اتوار تھا۔ وہ سارے دن سوتی ہی رہی۔ رات میں آنند آ گیا۔ ایک الگ کمرے میں بات چیت ہوئی۔

''رات کے واقعہ پر مجھے افسوس ہے پرتیبھا'' اس نے کہا ''اور وہ سب نشے کی حالت میں ہو گیا۔''

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے بس آنند سے اتنا ہی کہا ''میں اب فلم میں کام نہیں کروں گی۔''

آنند سناٹے میں آ گیا۔ بولا ''میری غلطی کی سزا فلم میں پیسہ لگانے والوں کو نہ دو۔ اب تک لاکھوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ وہ بے موت مر جائیں گے۔''

وہ پھر بھی خاموش ہی رہی اور آنند نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ آخر میں آنند نے کہا

''تم سمجھدار ہو۔ مجھے امید ہے کہ اس معاملے میں تم ٹھیک فیصلہ لوگی۔ میں کل اسٹوڈیو میں سیٹ پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

وہ چلا گیا۔ بہت سوچنے کے بعد اس کے دماغ نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ فلم مکمل کرنے کے بعد وہ فلم لائن چھوڑ دے گی۔

اگلے دن جب وہ اسٹوڈیو پہنچی تو آنند وہاں پہلے سے ہی موجود تھا اور اگلے شاٹ کے لئے مختلف لوگوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ اسے آنند ایک ناگ جیسا لگا۔ ناگ جس نے پچھلی سے پچھلی رات اسے ڈس لیا تھا۔ وہ جب قریب آیا تو اس نے پرتیبھا کو دیکھ کر ''ہلو'' کہا مگر پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ جیسے ان دونوں کے درمیان کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہ ہو۔ جیسے کسی لڑکی کو برباد کر دینا ایک بہت معمولی بات ہو۔ اس آنند نے اس طرح پہلے بھی نہ جانے کتنے شکار کئے ہوں گے اور کتنی لڑکیوں کو برباد کر دیا ہو گیا۔ قصائیوں کی طرح کتنے بے رحم ہوتے ہیں آنند جیسے لوگ۔

آنند نے اسے اگلا سین سمجھایا۔ اور جب کیمرہ اسٹارٹ ہوا تو وہ اپنے کردار اور فلمائے جانے والے جذباتی سین میں کھو گئی۔ جذباتی سین آج بہت نیچرل ہوا تھا اور آنند ہی نے نہیں، سبھی نے اس کے کام کی تعریف کی تھی۔

اگلے روز جب وہ شوٹنگ کے لئے اسٹوڈیو آئی تو اسکرپٹ رائٹر نے میک اپ روم میں ہی آکر اسے اگلے کچھ سین پڑھ کر سنائے۔ سین سن کر پرتیبھا سناٹے میں آگئی۔ آج فلمائے جانے والے سارے سین سیکس سے بھرپور تھے۔ اور آج پہلی بار ہی اسے بتایا گیا کہ فلم میں اس کا ڈبل رول ہے۔ دوسرا رول کہانی کی ہیروئن کی جڑواں بہن کا تھا جو ایک آوارہ قسم کی لڑکی ہے۔ وہ اپنے محبوب کو ایک ٹھیکہ دلانے کے لئے کمپنی کے ادھیڑ عمر سیٹھ کو رجھاتی ہے۔ اس کے سامنے نیم عریاں رقص کرتی ہے اور پھر جب سیٹھ دیوانوں کی طرح اس کو حاصل کرنے کے لئے آگے پیچھے دوڑتا ہے تو وہ اس سے دور بھاگنے لگتی ہے۔ لیکن جب سیٹھ کے ہاتھ آجاتی ہے تو پھر سیٹھ اس پر دیوانہ وار ٹوٹ پڑتا ہے۔

''میں نہیں کروں گی یہ سین'' اس نے رائٹر سے کہہ دیا ''آنند جی سے کہو کہ وہ اسکرپٹ میں تبدیلی کرالیں''

رائٹر باہر گیا تو آنند دوڑا دوڑا آیا۔

''یہ اسکرپٹ رائٹر کیا کہہ رہا ہے پرتیبھا۔تم نے اگلے سین کرنے سے انکار کر دیا ہے''؟

''ہاں کر دیا ہے۔ کیونکہ میں ایسے بے شرمی کے سین نہیں کر سکتی۔ اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا تو میں فلم لائن میں کبھی نہ آتی''۔

آنند سمجھ گیا تھا کہ وہ اس رات والی بات سے ابھی تک خفا ہے۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔ یہ پچوایشن سنبھالنا ذرا مشکل تھا کیونکہ مڈل کلاس گھرانے سے نکلی ہوئی کوئی بھی سادہ لوح لڑکی سیکس کی دنیا میں داخل ہوتے وقت اسی طرح گھبراتی ہے۔ لیکن ایسا صرف شروع شروع میں ہی ہوتا ہے۔ بعد میں تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ایک بار کوئی کنواری اس سیکس کی آگ میں جلی تو پھر ہمیشہ ہی جلنا پسند کرتی ہے۔ یہ پرتیبھا بھلا کس کھیت کی مولی ہے۔ اور اب تو وہ اپنا سب کچھ کھو ہی چکی ہے۔ بس کیمرے کے سامنے بے شرمی سے سین کرنے کے لئے اسے راضی کرنا تھوڑا مشکل ہوگا۔

''دیکھو پرتیبھا، اب تم ایک آرٹسٹ ہو اور ساری آرٹسٹ لڑکیاں آج کل فلموں میں ایسے سین دیتی ہیں۔ اور جو لڑکیاں اپنی پہلی ہی فلم میں Revealing Scenes دے دیتی ہیں تو ان کی بہت ڈیمانڈ ہو جاتی ہے''۔

''میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں''۔

''مجھے معلوم ہے ڈیئر، مگر آج فلم میں کروڑوں روپیہ لگتا ہے، اسے نکالنے کے لئے پکچر میں اس طرح کے دو چار سین ڈالنا ہی پڑتے ہیں۔ نہیں تو فلم بکتی بھی نہیں۔ آج ہر ہیروئن کو ایسے Revealing سین دینا ہی پڑتے ہیں''۔

''مگر میں ایسے سین نہیں کروں گی۔ آپ دوسری ہیروئن لے لیجئے''

''پاگل مت بنو۔ تم اس لائن میں آ چکی ہو اور ایک بار آ جانے کے بعد کوئی واپس نہیں جاتا۔ ہماری اس فلم پر اب تک پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ اور فلم کی کہانی کو بھی اب میں نہیں بدل سکتا۔ تم ایسا کرو کہ آج تین سین کرا دو، باقی میں تمہاری ڈپلی کیٹ سے کرا لونگا''۔

پرتیبھا دل مسوس کر رہ گئی۔ کوئی کوئی فلم والے بہت چال باز ہوتے ہیں۔ جس

راہ پر وہ چل پڑی تھی اس پر واقعی واپسی کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے شوٹنگ کے لئے میک اپ کرنا ہی پڑا۔ سیٹ پر سے بھی غیر ضروری لوگ نکال دیئے گئے۔

اُف............! بڑی بے شرمیوں کا اسے سامنا کرنا پڑے گا۔ لباس اسے ایسا پہنایا گیا کہ اس میں سے ہر جگہ بدن جھانک رہا تھا۔ یہ لوگ بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں تو انہیں وصول بھی کر لیتے ہیں۔ جب آرک لیمپوں کی تیز روشنیاں اس پر ڈالی گئیں تو وہ بہت شرمائی۔ ایسا لگا اسے کہ جیسے اسے عریاں کر کے بازار میں نیلام کیا جانے والا ہے۔

کیمرہ مین کو ہدایات دینے کے بعد آنند اس کے پاس آیا اور بولا ''پرتیبھا، اپنا موڈ ٹھیک کرو، تمہارے چہرے پر بہت گھبراہٹ ہے۔ تم بھول جاؤ کہ تم پرتیبھا ہو۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم فلم کی کیریکٹر نیلما ہو۔ نیلما، جسے ایک سیٹھ کو رِجھانا ہے۔ اور پھر اس کی بانہوں میں چلی جانا ہے۔ تم ایک آرٹسٹ ہو اور تم کو اپنے کام میں آرٹ لانا ہے۔ یہ آرٹ ہی انسان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچاتا ہے۔ تم بے خوف ہو کر آرٹ کی بلندیوں کو چھونے کی اور خود کو بلندیوں پر لے جانے کی کوشش کرو۔ کیوں کہ ایک دن تمہیں اسٹار بننا ہے.....''

موجودہ حالات میں اس کا دماغ کچھ ٹھیک طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ اب اسے وہی کرنا پڑے گا کہ جو آنند کہتا ہے۔ وہ اب آنند کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ وہ چاہے گئے سین کرنے کو تیار ہو گئی۔

کچھ ایسے بے شرمی کے سین تھے وہ کہ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ سیٹھ کا کردار ادا کرنے والا اداکار رنگے خاں بھوپالی اسے بہت کس کے اپنی بانہوں میں لے لیتا تھا اور پھر اپنا منہ اس کے منہ پر..... توبہ..... وہ کیا سے کیا ہو چکی ہے اور کیسے کیسے لوگ کتنی دیدہ دلیری سے اس کے جسم کو چھونے لگے ہیں..... جب ایسے مناظر پردے پر اس کے ماں باپ اور اس کے عزیز دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ وہ تو ان کو پھر اپنا منہ بھی نہ دکھا پائے گی۔

دو تین کٹس کے بعد جب شاٹ لے لئے گئے تو سبھی نے اس کے کام کی تعریف کی۔ ایسا لگا اسے کہ جیسے سب نے اس کے کام کی نہیں بلکہ اس کے نیم عریاں جسم کی تعریف کی ہو۔ وہ جلدی سے میک اپ روم کو دوڑ گئی۔ اپنا جسم اچھی طرح ڈھانکنے کے لئے۔

تقریباً روزانہ ہی شوٹنگ چلتی رہی۔ شوٹنگ پر اب ماماتیش ہی عموماً اس کے

ساتھ آتا تھا لیکن دن میں یا پیک اپ سے پہلے کسی وقت ستیش کو آنند اپنی کار اور کچھ روپے گھومنے پھرنے کے لئے دے دیتا تھا اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا نام لے کر کہتا تھا کہ وہ رات میں نو بجے کے قریب وہاں پہنچ جائے کہ فلم کے سلسلے میں لوگوں سے ملنے ملانے کے بعد وہ دونوں بھی وہیں پہنچیں گے۔ ستیش سب سمجھتا تھا کہ شوٹنگ کے بعد دونوں کیا گل کھلائیں گے، لیکن ایسا تو فلم انڈسٹری میں ہوتا ہی ہے۔ اور پرتیبھا کو کوئی کہاں تک بچا سکتا ہے۔ اتنی دولت کمانے کے بعد عیش کرنے کا اسے بھی تو حق ہے۔

لیکن آنند کے ساتھ اس کے فلیٹ میں جا کر پرتیبھا کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر رات بے شرمی اور سب کچھ وہ جو ایک کنواری لڑکی کے لئے ممنوعہ ہے۔ بے شک ممبئی میں بہت سے خراب لوگ ہیں لیکن بے شمار اچھے گھرانے بھی ممبئی میں ہیں۔ وہ اور ہوں گی جو فلموں کی شہرت اور دولت کے لئے اپنی عزت خوشی خوشی داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ تو یہاں آ کر بہت پچھتا رہی ہے۔ ہر رات آنند اس کی عزت تار تار کر دیتا ہے اور اسے نیک نامی سے بہت دور لے جا کر پھینک دیتا ہے۔ اس کی روح اور ضمیر ہر رات کچلے اور مسلے جا رہے ہیں۔ وہ یہاں تنہائی میں آنند کے ساتھ اس طرح آ جاتی ہے جیسے اس نے اسے Hypnotized کر دیا ہو اور جب وہ ستیش کے ساتھ گھر واپس جاتی ہے تو اس کی روح بہت بے چین ہو جاتی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ وہ کیا سے کیا بنتی جا رہی ہے۔ جیسے جیسے اس کی فلم تعمیل کے مراحل طے کر رہی ہے وہ پاکیزگی کی زندگی سے دور ہوتی جا رہی ہے اور گناہوں کے دلدل میں پھنستی چلی جا رہی ہے۔

اور پھر آخر کار فلم نمائش کے لئے پیش کر دی گئی۔ پریمئر میٹرو سینما میں تھا۔ نہ صرف فلم کی بلکہ اس کے کام کی بھی بہت تعریف ہوئی اور وہ ایک کامیاب اور پرکشش ہیروئن مان لی گئی۔ دیگر فلم سازوں اور فائنانسروں نے نہ صرف اسے مبارکباد دی بلکہ وہ اسے اپنی نئی فلموں میں لینے اور اس پر روپیہ لگانے کو بھی تیار ہو گئے۔

اگلے چند دنوں میں فلم کے جو تبصرے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ان میں سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے اس کی عریانی پر سخت تنقید کی گئی۔ پھر کچھ سہیلیوں اور رشتے دار معزز خواتین نے بھی اسے برا بھلا کہا۔ وہ جو پہلے سے دکھی دکھی سی تھی۔ اب

اور بھی رنجیدہ ہوگئی۔

لیکن اس کے پاس نئی فلموں کے آفر آنے لگے۔کبھی ستیش ماما تو کبھی خود وہ کہانیوں کا خلاصہ سننے لگے۔لیکن سبھی کہانیاں یا تو سیکس کے موضوع پر مبنی تھیں یا اس کے رول کے ساتھ سیکس وابستہ تھی۔ایک مجبور لڑکی ممبئی آتی ہے جسے کئی لوگ پکڑ کر اپنی ہوس کا شکار بنا لیتے ہیں۔یا ایک یتیم و بے سہارا لڑکی کو کال گرل بنا دیا جاتا ہے۔یا ایک شادی شدہ عورت اپنے محبوب سے ناجائز تعلقات قائم کر لیتی ہے۔یا......

یعنی پہلی فلم میں سیکسی رول کرنے کے بعد اس کی امیج اب صرف سیکس کی گڑیا کی تھی۔ہر کوئی اس کا جسم پردے پر دکھا کر دولت بٹورنا چاہتا تھا۔یعنی اب اسے بار بار کیمرے کے سامنے اور پھر سنیما گھروں میں پبلک کے سامنے عریاں ہونا پڑے گا۔اور اس کی روح کو مسلسل زخمی ہوتے رہنا پڑے گا......اور یہی نہیں، جو فلمساز اس کے پاس نئی فلموں کے آفر لے کر آتے تھے اور جن کے ہاتھوں میں روپیوں سے بھرے بریف کیس ہوتے تھے، ان کی آنکھوں میں اس کا جسم حاصل کرنے کی امید کی چمک بھی صاف نظر آتی تھی۔وہ سب اسے اس طرح دیکھتے تھے جیسے پھنکارتے ہوئے ناگ دیکھتے ہیں۔آنند کی طرح وہ لوگ بھی ہیروئن کو دی جانے والی بڑی بڑی رقمیں پہلے اپنی ہیروئن سے وصول کرنا جانتے ہیں۔بریف کیس اور سوٹ کیس بھر بھر کر دو نمبر کی دولت لانے والے یہ بدکار لوگ یقیناً اسے ایک اونچے درجے کی رنڈی بنا کر چھوڑیں گے۔

نہیں......نہیں......وہ اب ایسا قطعی نہ ہونے دے گی۔وہ دولت کو ٹھکرا دے گی اور پھر سے ایک صاف ستھری زندگی شروع کرے گی۔

وہ ایک ایک کر کے فلم سازوں کو واپس کرنے لگی۔اس نے ماں سے کہہ دیا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی، کیونکہ ساری ہی فلمیں ہیروئن کے جسم کی نمائش کرتی ہیں اور یہ اسے قطعی پسند نہیں۔ماں تو یہ سن کر دنگ رہ گئی۔وہ سوچنے لگی کہ کہیں بیٹی سنک تو نہیں گئی۔یا شاید فلم کی محنت سے تھک گئی ہے۔

ماں نے پرتیبھا کو سمجھانے کی کوشش کی تو پرتیبھا کچھ برہم ہو کر بولی۔

''طوائف تو برا کام چھپ کر کچھ اس طرح کرتی ہے کہ جسے دوسرے لوگ نہیں

دیکھتے مگر فلم میں جب کوئی ایکٹریس اپنا بدن دکھاتی ہے تو لاکھوں لوگ اپنے اپنے خیالوں میں اس کا بدن حاصل کرنے کی کلپنا (تصوّر) کرنے لگتے ہیں اور تب وہ ایکٹریس ایک طوائف سے بھی زیادہ گئی گذری ہو جاتی ہے''۔

''دیکھنے والے کیا سوچتے ہیں یا کیا کلپنا کرتے ہیں اس کی تمہیں چنتا نہیں کرنا چاہئے۔'' ماں بولی ''کوئی بھی ایکٹریس نہیں کرتی۔ ایکٹنگ تو ایک کلا ہے۔ اور وہ جو کچھ کیمرے کے سامنے ہوتا ہے وہ ذاتی زندگی میں نہیں ہوتا، یہ سبھی جانتے ہیں۔''

پرتیبھا سوچنے لگی کہ اس کی ماں بوڑھی ہونے کے باوجود کتنی نادان ہے۔ اسے کیا پتہ کہ فلم میں یا کیمرے کے سامنے جو کچھ ہوا اس سے کہیں زیادہ تو اب تک اس کے ساتھ ہو چکا ہے۔ آنند اسے ایک ہڈی سمجھ کر کتے کی طرح کئی بار چچوڑ چکا ہے۔ اس طرح کی فلموں کا سلسلہ اگر جاری رہا تو آگے بھی اس کے ساتھ نہ جانے کیا کیا ہوگا اور نہ جانے کون کون اس کو Exploit کرے گا۔ ماں گھر میں نوٹ گنتی رہے گی اور آنند جیسے لوگ اسے شراب پلا پلا کر اس کی عزت لوٹتے رہیں گے، کیونکہ اس انڈسٹری میں کئی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ فلموں میں آنے والی نئی نئی لڑکیاں ان کے جھانسے میں آ ہی جاتی ہیں، جیسے کہ وہ خود آنند کے جھانسے میں آ گئی۔ لوگ فلم پر لاکھوں کروڑوں روپے لگاتے ہیں تو اپنی کسی کسی ہیروئن سے کچھ رقم وصول بھی کرتے چلتے ہیں۔ اپنی عزت کو داؤ پر لگا دینا یا مسلسل لگاتے رہنا یہاں کچھ لڑکیوں کی پروفیشنل مجبوری بھی ہوتی ہے۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے ماں، میں اب فلموں میں کام نہیں کروں گی'' اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا ''جب تک کوئی ہیروئن لڑکی بہت مشہور نہیں ہو جاتی، اس کی عزت داؤ پر لگی رہتی ہے۔''

''تیری ایک فلم ہٹ ہو چکی ہے اور کامیابی تیرے قدم چوم رہی ہے۔ یہاں جتنا پیسہ ہے اتنا کسی اور کام میں نہیں۔ تم بعد میں اچھی طرح سوچنا اور میں بھی تمہارے پاپا سے مشورہ کروں گی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نیپال گئے ہوئے ہیں، پرسوں صبح کی فلائٹ سے بمبئی لوٹ آئیں گے''

ماں کی خود غرضی سے اسے بہت دکھ ہوا۔ کاش کہ ماں سمجھ سکتی کہ دولت اور شہرت

تیاگ کر وہ فلم لائن کیوں چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ کاش وہ سمجھ سکتی کہ یہاں اس لائن میں اسے کس قدر گھٹن محسوس ہو رہی ہے اور وہ روز روز گناہوں کی دلدل میں دھنستی چلی جا رہی ہے اور اس کی روح کس قدر بے چین ہے۔

دو روز بعد ہی اس کے پتا جی نیپال سے لوٹ آئے۔ آتے ہی پرتیبھا کی ماں نے ان کے کمرے میں جا کر ان کو بیٹی کے فلم لائن چھوڑنے کے بارے میں بتایا۔ سب کچھ بہت دھیان سے سننے کے بعد ناڈکرنی جی بولے۔

''میں خود اسی سے پوچھتا ہوں۔ کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ کہاں ہے۔؟''

پرتیبھا آئی تو وہ اس سے بولے ''میں نے تو بیٹے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ فلم لائن میں مت جاؤ، مگر اُس سے تم نے میری ایک نہ سنی''۔

''میں اپنی غلطی مانتی ہوں پاپا۔ آج مجھے سمجھ میں آ رہا ہے کہ آپ نے اس وقت مجھے صحیح مشورہ دیا تھا''

پاپا کتنے اچھے انسان ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔ ماں کے مقابلے میں باپ لوگ ہی اپنی بیٹیوں سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور وہ ہی اپنی بیٹیوں کا درد ٹھیک طرح سمجھتے ہیں۔ پاپا ضرور اس کی مدد کریں گے اور اسے گناہوں کی دلدل سے نکال لیں گے۔

''لیکن تمہیں یہاں پریشانی کیا ہے، بیٹی...... میرا مطلب ہے کہ تم فلموں کے خلاف ایک دم کیوں ہوگئی ہو جبکہ تمہاری ایک فلم ہٹ بھی ہوگئی ہے اور دوسری فلموں کے آفر بھی آنے لگے ہیں۔ اچانک ایسی کیا بات ہوئی کہ تم بڑی بڑی رقمیں بھی ٹھکرا دینا چاہتی ہو''

شرم کے مارے باپ کے سامنے وہ کھل کر نہیں کہہ سکتی تھی۔ لیکن کچھ تو ان کو بتانا ہی ہوگا۔

''وہ.......... بات یہ ہے پاپا کہ میں نے جب پہلی فلم لی تھی تو میں سمجھی تھی کہ کالج کے ڈراموں کی طرح مجھے یہاں بھی اچھے رولز ملیں گے اور پرانے اداکاروں کی طرح مجھے بھی ایکٹنگ کا موقع ملے گا۔ لیکن یہاں بات کچھ اور ہی ہے۔ یہاں ہیروئن کو سیکس ڈال بننا پڑتا ہے جو مجھے پسند نہیں اور میری پہلی فلم میں میرا ایک رول خراب لڑکی کا تھا نا، اس لئے اب خراب لڑکی کے رولز کے آفر ہی میرے پاس آ رہے ہیں۔ کچھ ایسے رولز کہ جن کے لئے

مجھے Revealing لباس پہنائے جائیں گے۔ مجھے یہ سب برا لگتا ہے اور میں ایسے رول نہیں کرسکتی۔''

''میں تمہاری بات سمجھتا ہوں بیٹی'' ناڈکرنی جی گلا صاف کر کے بولے ''لیکن بات بس یہی ہے نا۔؟''

''نہیں پاپا...... بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ مجھے اس فلم لائن کا ماحول ہی پسند نہیں۔ اور میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں کہ یہاں بہت لوگ عورتوں پر خراب نظر رکھتے ہیں۔ بہت بے شرمی ہے یہاں۔ یہاں گناہوں کی دلدل ہے۔ اور یہ سب مجھے پسند نہیں، کیونکہ میں آپ جیسے سیدھے سچے انسان کی سیدھی سادی لڑکی ہوں''۔

ناڈکرنی کچھ دیر خاموش رہے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر بولے۔

''اب تو یہاں سے واپس لوٹنا بہت مشکل ہے بیٹی۔ تم گناہوں کی دلدل کی بات کرتی ہو، میں لین دین کی دلدل میں پھنس چکا ہوں۔ تمہاری دو فلموں کے ایڈوانس میں چھ لاکھ روپے میں پرڈیوسروں سے لے چکا ہوں۔ ایک ٹویوٹا بک کر چکا ہوں اور بہت سے لین دین ابھی ہونے والے ہیں۔ تمہیں پانچ سات فلمیں ملنے والی ہیں اور ان فلموں سے ہمیں ایڈوانس قریب پچاس لاکھ روپے ملے گا۔ پچاس لاکھ روپے، تم سمجھتی ہو کہ کتنی بڑی طاقت ہوتے ہیں۔ اب یہ بے شرمی کی، گناہوں کی اور دلدل کی بات بے کار ہے۔ دلدل جیسی بھی ہو، ہم اس میں پھنس چکے ہیں۔ تم ایک بہت بڑی ہیروئن بننے والی ہو کیونکہ کئی پرڈیوسر ہمارے چکر کاٹ رہے ہیں اور یہ سب تمہاری کلا کی وجہ سے ہی ہے۔ ہم لوگ جلد ہی بہت امیر ہونے والے ہیں۔ ہم کو اب پھر سے غریب نہیں ہو جانا چاہئے۔ غریبی بہت بری چیز ہے، یہ میں اب روپیہ آنے اور آرام و آسائش حاصل ہو جانے کے بعد ہی سمجھ سکا ہوں۔ اس ماحول میں اپنے آپ کو اور خاص طور پر اپنے Mind کو ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کرو۔ اور ہاں...... برے لوگوں سے بھی بے شک بچنے کی کوشش کرو......''

پرتیبھا اپنے باپ کو دیکھتی رہ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ دلدل میں بہت نیچے کو دھنستی جا رہی ہے۔ اور اب کوئی نہیں ایسا کہ جو اسے اس دلدل سے نکال سکے۔

☆☆